منتخب افسانے

۱۹۶۸ء کے منتخب افسانے

اور کھل کر قلم اُٹھایا ہے۔ لیکن زندگی کی کسی وسیع تر بصیرت یا آگہی کا احساس اُن کے افسانوں میں مفقود ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کرشن چندر کی طرح ہی ہلکے پھلکے رومانی افسانوں سے کیا۔ کرشن چندر نے اس مقصد کے لئے کشمیر کی حسین وادی کا انتخاب کیا تھا۔ قاسمی نے اپنے رومان پنجاب کے دیہاتوں سے حاصل کئے۔ لیکن قاسمی کا فن ارتقار کی ایک ایسی داستان ہے جو اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملیگی۔ انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دریچے نئی ہواؤں کے لئے ہمیشہ وا رکھے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں فن اور تکنیک کے نت نئے تجربے کئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ اردو کے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ قرۃ العین حیدر ان سب سے کم عمر ہیں۔ لیکن تکنیک کی جدت کے اعتبار سے ان کی کہانیاں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں ماضی کی سمت مراجعت کا احساس بہت شدت سے ملتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ خامی اُن کے افسانوں سے دور ہوتی گئی۔ اور اب ان میں وہ سکون اور ٹھیراؤ کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ جو بلند پایہ افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اُنہوں نے زندگی کو جس وسیع تاریخی اور سماجی پس منظر کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہ اردو افسانہ نگاری میں بالکل نئی چیز ہے۔

اس دور میں جب اردو افسانہ بڑی حد تک او۔ ہنری۔ موپاساں اور چیخوف کے افسانوں کی ہیئت کی تقلید کر رہا تھا۔ یورپ میں افسانہ بنیادی تبدیلیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ صنعتی تہذیب کی خشر سامانیوں نے سماج کو جس لاشخصی ڈھانچہ میں بدل دیا تھا اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور ایٹمی ہتھیاروں کی دریافت نے

دکھلائی دے رہے تھے جیسے کسی تازہ کھلے ہوئے پھول پر شبنم کی ننھی بوندیں جگمگا رہی ہوں۔ ایک بھولا ہوا چہرہ جوانجان بھی لگتا اور شناسا بھی اس کی نظروں کے سامنے ابھر آیا۔ مگر وہ گیئر کا ڈنڈا نہ تھا، جس کو وہ پکڑے ہوئے تھی، بلکہ ایک کیکر کا ننھا نابالغ درخت تھا جس کے تنے کو پکڑے ہوئے وہ ہانپ رہی تھی۔ کوئی ایک میل تک کھیت کی پگڈنڈیوں پر دوڑ کر اس نے اس کو پکڑا تھا۔ اور اب پسینے کی بوندوں میں وہ جھلملاتا ہوا درخون کی گردش سے سرخ ہوتا ہوا چہرہ اس کے ایک دم قریب تھا، اتنا قریب کہ اگر وہ چاہتا تو اس چہرے کو چوم بھی سکتا تھا۔

سونا کی گرفت ڈھیلی پڑی تو گیئر کڑکڑانے لگا ــــ عجائب سنگھ جیسے چونک گیا۔

"اوئے تیری ماسی کھانا نہیں دیتی تجھے، زور لگا کر پکڑ"

ایک ہاتھ سے گیئر کا ڈنڈا پکڑ سونا نے دوسرا ہاتھ دکھلایا۔

"دیکھ ہاتھ کیا لال ہو گیا ہے"

پھٹے ہوئے محنت کش ہاتھ کی ہتھیلیاں سرخی مائل ہو گئی تھیں۔ ایک بار بہت پہلے کسی نے اپنی ہتھیلی اس کے آگے کر دی تھی وہ دودھ ملو کر اٹھی تھی اور رسی سے زور آزمائی کرنے کے بعد وہ ہتھیلی ایک دم سے لال بھبوکا ہو گئی تھی۔ عجائب سنگھ نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا تھا اور اچانک اس نے ہتھیلی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے..... آج بھی پتہ نہیں کیوں اپنے سامنے پھیلی ہوئی ہتھیلی کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ اس کو چوم لے.....

"ارے سامنے دیکھو" سونا نے اس کو ایک ٹک ہتھیلی کی طرف دیکھتے دیکھ کر ٹوکا۔

اس نے جھجک کر اپنا چہرہ سامنے کر لیا۔ سامنے سڑک بل کھاتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی ......

ڈپو میں منتی نے سونا کو آگے بیٹھے دیکھ کر فقرہ کسا۔

"یار، عجائب سنگھ! بڑا خوبصورت ٹب گیر لگایا ہے تو نے"۔

عجائب سنگھ گاڑی کھڑی کر کے نیچے کود آیا۔

"کیا منتی، تو بھی جلتا ہے؟"

منتی ہنسا "نہیں یار میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ تو بھی بالغ ہوتا جا رہا ہے"

لڑکیوں نے ایک طرف کا ڈالا کھول دیا۔ اور فرش پر ایک بید کی ٹوکری الٹ کر رکھ دی۔ جس پر چڑھ کر وہ بولڈر ٹرک پر لوڈ کرتی تھیں۔

عجائب سنگھ اپنا صافہ کھول کر اپنے کیس سنبھالنے لگا۔

وہ پہاڑی علاقہ جس میں یہ چھوٹا سا دو منزلہ مکان، چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے درمیان تنہا تنہا کھڑا تھا۔ لگ بھگ تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ یہ دو منزلہ مکان چھوٹے بابو کے پتا نے جو بڑے ٹھیکے دار صاحب کے نام سے مشہور رہیں، بنوایا تھا۔ تب انھوں نے پی۔ ڈبلیو ڈی میں جیپ سپلائی کرنے کا نیا نیا ٹھیکہ لیا تھا۔ شروع شروع میں تو ویسے ہی پہاڑی آبادی کے سرداروں اور چھوٹے چھوٹے ٹھیکیداروں سے جیپ کی خرید اندنا ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے ان کی آمدنی بڑھتی گئی اور جیپ کی مانگ مختلف اداروں سے

بڑھنے لگی تو انھوں نے مستقل مزدور رکھ کر پتھر تڑوانے شروع کئے۔ پھر کرشر منگوایا، پھر زمین خریدی، مکان بنوایا، پھر ٹرک خریدے گئے اور ان ٹرکوں کے ٹھہرنے کے لئے ایک بڑا احاطہ اس دو منزلہ مکان کے گرداگرد بنوایا گیا جس میں ایک طرف پانچوں ٹرکوں کے لئے جگہ مخصوص کی گئی۔ دوسری طرف بولڈر کا اسٹاک کرکے گودام بنوایا گیا۔ اس دو منزلہ مکان اور اس مکان اور اس مکان کے احاطے کے تین اطراف میں کچے جھونپڑے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی زمیندار کے گرد اس کے حواری بیٹھے ہوں۔ انہیں جھونپڑوں میں سے ایک میں سونا رہتی تھی۔

سونا کو اس کی ماسی نے پالا تھا۔ کہتے ہیں جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اس کے ماں باپ کسی وبائی مرض کا شکار ہو کر دنیا تیاگ گئے تھے۔ اس کی بیوہ موسی چوں کہ لاولد تھی اس لئے اس نے سونا کو رکھ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے رات دن محنت کرکے، مزدوری کرکے سونا کو پالا ہے حالانکہ بات ایسی نہیں۔ اب بھی اس بات کے جاننے والے اس بستی میں مل جائیں گے۔ کہ شہر میں وہ بہت عرصہ تک ایک پنجابی کی داشتہ کی حیثیت سے رہی تھی۔ اور جب وہ پنجابی مر گیا تو اس کی ساری دولت سمیٹ کر وہ یہاں آ بسی تھی۔ سونا نے اسی پنجابی موسا سے، پنجابی زبان کے دو چار فقرے سیکھ لئے تھے۔

اس پہاڑی علاقہ کی آب و ہوا نے بہت جلد سونا کے جسم کو سڈول کر دیا۔ اس کے چہرے پر صحت کا نکھار آ گیا۔ اور وہ کلی جو شہر کی گرم اور

دھوئیں سے بھری فضا میں کمہلا سی رہی تھی، ایک دم سے کھل کر پھول بن گئی۔

اور جب وہ پھول بن گئی تو بھونروں کی کیا کمی، ساری بستی کے لوفر جوان اس پر فریفتہ تھے۔ بڈھا خرانٹ منشی بھی اس کے لئے بعض اوقات بے چین ہو اٹھتا۔ ٹرک کے ڈرائیور اور خلاصیوں کے علاوہ شہر کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے ٹھیکے دار اس پر دم دیتے تھے۔ بلکہ یہاں تک سنا گیا تھا کہ چھوٹے بابو کی بھی نیت خراب ہے۔ مگر اس کی جہاں دیدہ موسی جانتی تھی کہ لوہا جب خوب گرم ہو جائے جب ہی اس پر ہتھوڑی مارنی چاہیے دنیا کی سرد و گرم چکھے ہوئے وہ عورت بظاہر بڑی بے تعلقی سے ان تمام باتوں کو دیکھ رہی تھی۔

لیکن عجائب سنگھ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ دراصل محبت کا لفظ ہی اس کے یہاں بے معنی تھا۔ البتہ ادھر کچھ دنوں سے وہ اپنے دل میں ایک عجیب بے نام سی خلش محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ سونا کو دیکھتا تو اس کو اپنا آپ بکھرتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کو ایسا لگتا جیسے اس کے اندر بہت اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر رہی ہے، جیسے آہستہ آہستہ کوئی بے نام سا چہرہ سونا کا روپ دھارن کر رہا ہو۔ جیسے وہ ٹرک پر کام کرنے والی کوئی آدمی باسی کا من (مزدور) نہ ہو بلکہ کسی دیہات کی کوئی الھڑ شوخ لڑکی ہو، جب وہ اس کے قریب ہوتی تو اس کے جسم کی حدت اور مہک کو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی وصال کی لذت، اس کے گلے میں باہیں حمائل کر دیتی اور وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے چین سا محسوس کرنے لگتا۔

اس بے چینی پر قابو پانے کے لئے اس نے کتنے ہی جتن کئے وہ دن دن بھر

لوگوں سے مذاق کرکے بے تحاشہ ہنستا۔ کبھی منشی کو چھیڑتا، کبھی ساتھی ڈرائیوروں پر فقرے کستا۔ اس نے سونا سے بات تک کرنا بند کر دیا۔ وہ اس کو کبھی اپنے قریب نہ آنے دیتا۔ کبھی اس کو نظر بھر کر نہ دیکھتا.... مگر وہ بے چینی بدستور تھی۔ بلکہ روز افزوں تھی اور وہ آہستہ آہستہ بہت آہستہ آہستہ ڈوبتا چلا گیا۔

اور جب اس نے منشی پر اپنی نیت آشکار کی تو وہ دم بخود رہ گیا۔

"سردار ہوش میں ہے یا دارو پی کر آیا ہے؟"

مگر عجائب سنگھ نے دارو نہ پی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہوش میں نہ تھا وہ محجوب سا ایک ٹک زمین کو دیکھا گیا۔ اس کو ایسے شرماتے دیکھ کر پہلے تو منشی خوب ہنسا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں آج سونا کی ماسی سے بات کرتا ہوں۔" اس نے عجائب سنگھ کا کاندھا تھپ تھپا کر کہا۔

اسی شام منشی نے سونا کی ماسی سے بات کی۔ مگر سونا کی ماسی کی شرائط بڑی کڑی تھیں۔ اس کی مانگ تھی۔ تین ہزار روپے نقد اور پانچ سو روپے شادی کا خرچ۔ عجائب سنگھ نے سنا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ لیکن اس نے منشی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اٹھ کے چلا آیا۔

اس نے اپنے اکلوتے بکس کو کھولا، جس میں اس کی پندرہ برس کی کمائی رکھی ہوئی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ رات گئے تک نوٹوں کو گنتا رہا۔ پورے پانچ ہزار چھبیس روپے نکلے۔ دوسری صبح اس نے منشی کو کہہ دیا کہ وہ حامی بھر لے۔

ڈپو میں عجائب سنگھ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ادھر سونا نے کام پر آنا بند کر دیا۔ وہ اب گھر سے باہر بھی کم ہی نکلتی تھی۔ لوگ اسے سردارنی کہہ کر چھیڑتے تو وہ خوش دلی سے ہنستی۔ عجائب سنگھ کو چھیڑ چھاڑ کر لوگوں نے پریشان کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک دن چھوٹے بابو نے بھی گرہ لگادی۔

"تم تو اس بستی کا کلیجہ نکال لے رہے ہو عجائب سنگھ۔"

جواب دینے کی بجائے وہ شرما کر بھاگ کھڑا ہوا اور اس کو اس طرح شرماتے دیکھ کر منشی اور ڈپو کے دوسرے تمام مزدور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مگر ان ہی دنوں جب عجائب سنگھ کی شادی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، ایک دن عجائب سنگھ کو خبر ملی کہ چھوٹے بابو اس کی گاڑی کو بیچ رہے ہیں۔ آج صبح کچھ لوگ آئے تھے اور ان سے کچھ بات چیت بھی طے ہو گئی ہے۔ شام کو عجائب سنگھ چھوٹے بابو سے ملا، تو انھوں نے صاف لفظوں میں اس کو بتا دیا کہ گاڑی کی بات چار ہزار روپے میں تقریباً طے ہو گئی ہے، ساتھ ہی انھوں نے عجائب سنگھ سے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں اس کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کو کوئی دوسری گاڑی دے دی جائے گی۔

عجائب سنگھ جب چھوٹے بابو سے بات کر کے لوٹا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا، چاند اوپر اٹھ آیا تھا۔ اور سفید دودھیا چاندنی اس ویران علاقے میں ایک عجیب اداس غم زدہ انداز میں جگمگا رہی تھی۔ تمام پیڑ، پگڈنڈیاں، کچی سڑک سڑک سے پرے کھیت، کھیتوں کے پرے جنگل، سب جیسے سوگوار کھڑے تھے۔ اس چاندنی کے سفید کفن میں ملفوف اس کی ڈوج ٹرک یوں چپ سادھے ہوئے

تھی، جیسے اس سے روٹھ گئی ہو۔

اس نے بونٹ پہ ہاتھ رکھا۔ وہ اس سرد لمس کی کیفیت کو دیر تک محسوس کرتا رہا۔

یہ گاڑی جو سات برس کے بے شمار لمحوں میں اس کی رفیق رہی تھی، وہ اس گاڑی کے ایک ایک انداز سے واقف تھا۔ آج اس کو اتنا سرد اور خاموش دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے وہ اس سے روٹھ گئی ہے یا جیسے محض اپنی سرد مہری کا اظہار کر رہی ہو۔

دو تین دن شدید ذہنی ہیجان میں مبتلا رہ کر آخر ایک رات وہ چھوٹے بابو کے کمرے میں جا دھمکا۔ چھوٹے بابو نے اتنی رات گئے اس کو اپنے پاس آتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"حضور!" اس نے اپنا صافہ اتار لیا۔ "حضور! اگر آپ یہ گاڑی بیچنا ہی چاہتے ہیں تو مجھے دیدیں، میں اس کی قیمت آپ کو چکا دیتا ہوں۔"

پہلے تو چھوٹے بابو حیرت زدہ ہو گئے۔ پھر ذرا سا مسکرائے اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

"اتنے روپے ہیں تمہارے پاس؟ سنا ہے شادی میں بہت خرچ ہو رہا ہے۔"

"شادی کو گولی ماریئے۔" عجائب سنگھ نے تیزی سے کہا۔ "میرے سسر کی بیٹی ہی مجھے مل جائے، یہی بہت ہے!!"

چھوٹے بابو بڑی خوش دلی سے ہنسے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل شہر جاتے ہوئے روپے لیتے چلنا، وہیں لکھا پڑھی کرا دوں گا۔"

دوسری صبح عجائب سنگھ نے غسل کیا، نئی قمیض پہنی، آنکھوں میں سرمہ لگایا، صافہ جسے وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھتا تھا خوب کس کر باندھا اور نوٹوں کی گڈیوں کو اپنی نچلی جیبوں میں ٹھونس کر جب ٹرک اسٹارٹ کر کے چلا تو یوں لگتا تھا جیسے شادی کرنے جا رہا ہو۔

دن بھر کی تگ و دو کے بعد گاڑی اس کے نام ہو گئی۔ شام کو جب پولیس آفس سے اس کو چھٹکارا مل گیا تو اس نے وہ نارنجی رنگ کا نیا کلف دیا ہوا صافہ نکالا جسے اس نے اپنی شادی کے لئے خریدا تھا، اور اس کو گاڑی کے بونٹ پر آڑا ترچھا کر کے باندھ دیا۔ اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے بڑے پیار سے گیئر دیا اور ریلوے مال گودام کی طرف آہستہ سے گاڑی گھما لی۔

—— شبخون الہ آباد

✤

قالین

اقبال متین

ابّی جب گھر کا قالین کہیں دے آئے تو شہزادی بہت اداس ہو گئی۔ یہ قالین کیا تھا ایک پھلواری تھی جو پیروں تلے بچھی رہتی ۔ پیروں تلے روندی جاتی ۔ لیکن نہ پھول مرجھاتے نہ کلیاں سسکتیں۔

اس پھلواری کے ساتھ شہزادی کے ذہن میں اپنی امی کا تصور کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گیا تھا کہ وہ قالین کی نسبت سوچتی تو امی ذہن میں در آتیں۔

آج اسے اپنا کمرہ سونا سونا لگ رہا تھا۔ اس کی امی بھی لہلہاتی پھلواری کی طرح شگفتہ تھیں۔ پھر وہ ہوئی ۔ یعنی وہ تولد ہوئی ۔ یعنی وہ دنیا میں آئی ۔ پھر امی کی لہلہاتی پھلواری کی کوکھ سے پھوٹی ہوئی اس نو شگفتہ کلی نے انگڑائی لی تو لوگوں نے کہا شہزادی بڑی ہو گئی۔ اور بڑی ہوتے ہوتے جو بات شہزادی کے ذہن میں جڑ پکڑ گئی وہ یہ تھی کہ امی قالین ہیں۔ اور ہم سب انہیں روندتے پھرتے ہیں۔ اور ان روندنے والوں میں اس کے ابّی ہیں۔ وہ خود ہے پھر دلی میاں ہیں، پھر علی میاں ہیں، پھر مسلسل بکواس کرنے والی شبی ہے۔ پھر شبی سے دن رات لڑنے والی ریحی ہے۔ جس کی چوٹی کی موباف کبھی کھانے کی

پلیٹ میں ملتی ہے، کبھی کتابوں کے لئے ہیں، کبھی پڑی جھڑی چیزوں اور کچرے میں۔ پھر اس کے بعد تو سلسلہ بڑا لمبا سا لگ گیا ہے۔ سوچو تو یوں لگے جیسے جوتیوں میں دال بٹ رہی ہو۔

جانے کیوں شہزادی کے ذہن میں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں آئیں — اپنے ہی بھائیوں اور بہنوں کے بارے میں کچھ اس طرح سوچا کہ دبی دبی نفرت جھنجھلاہٹ کا سبب بنے لئے کھلتا تھا۔

منے چچا، ٹنے اودھم مچاتا اور چھوٹو الگ گھر سر پر اٹھائے رہتا۔ اور امی بیچاری نحیف سی آواز میں سب کو ہٹاتیں اور قالین پر گٹھری بنی پڑی رہتیں۔

لیکن امی جب سے قالین کہیں دے آئے تھے امی تخت پر ہی بغیر کچھ بچھائے یوں دراز ہو جاتیں جیسے ان کے بدن کو قالین کے پھول خار بن کر کھٹکتے تھے اور اب سخت تخت کی لکڑی نرم نرم گدی بن کر سکون پہنچاتی ہے۔

شہزادی نے جب ہوش سنبھالا تھا اس وقت یہ قالین ڈرائنگ روم میں بچھا تھا۔ جیسے ڈرائنگ روم کے فرش پر رنگ برنگی پھول بکھیر دیئے گئے ہوں۔ قالین کے اطراف بید کی کرسیاں تھیں، بیچوں بیچ خوبصورت سی میز تھی کرسیوں پر کشن تھے اور درمیانی میز پر امبرائیڈری کا میز پوش، کونے کے ہک تسلف پر ریڈیو رہتا تھا اور دیواروں پر مٹی کے رنگین واز تھے جن میں پلاسٹک کے پھول یوں لگتے تھے۔ جیسے ابھی ابھی باغ سے توڑ کر سجائے گئے ہوں۔

لیکن دلی میاں اور علی میاں آئے تو لوگ کہتے تھے گھر کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔

انسانیت کے وجود کو جس جوکھم میں ڈال دیا تھا اس کا اثر اب پر بھی پڑ رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے ادیبوں کو سائنس اور صنعتی ترقی کے متعلق تشکک کا شکار ضرور بنایا تھا اور ماضی کی ان روایات اور قدروں کی طرف اُن کی نگاہیں اُٹھنے لگی تھیں جن سے اُن کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا لیکن انسانیت کے مستقبل سے وہ بالکل نا امید نہیں ہوئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم اور ایٹمی ہتھیاروں کے خطرے نے ادیبوں کی رہی سہی امید بھی چھین لی۔ انہیں ساری دنیا موت کے دہانے پر بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس صورت حال نے مایوسی اور بے یقینی کی جو کیفیت پیدا کی اس کا اظہار ادب میں ہونے لگا۔ اس کے علاوہ صنعتی ترقی کے نتیجے کے طور پر انسان مشین بنتا جا رہا تھا اور فرد کی حیثیت سے اُس کی ذات ختم ہوتی جا رہی تھی۔

اس کھوئی ہوئی ذات کی تلاش بھی افسانوی ادب کا ایک اہم موضوع بنی، صنعتی تہذیب نے جن غیر شخصی طاقتوں کو جنم دیا اُن سے انسان کو اب دہشت محسوس ہونے لگی تھی ایلن جنس برگ، سارتر، کامو، ولیم بروز، ہنری ملر، ہرلڈ رابنس وغیرہ نے اپنی افسانوی تخلیقات میں کم و بیش اسی صورت حال سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مواد سے قطع نظر اُن کے افسانوں کی ہیئت اور تکنیک موپاساں اور چیخوف کی کہانیوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں وہ قصہ گوئی بھی نہیں ہے جو کہانی کی بنیادی صفت رہی ہے۔ شاید یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہوگا کہ وہ صنف ادب جسے ہم افسانہ کہتے ہیں چیخوف پر ختم ہو چکی ہے۔ اور اب جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ کم از کم ان معنوں میں افسانہ نہیں ہے۔ جن معنوں میں موپاساں اور چیخوف کی تخلیقات افسانہ تھیں۔ اس رجحان کا اثر گذشتہ چند برسوں سے اردو افسانہ پر بھی پڑنے لگا ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا

کیا خاک بڑھ گئی ہے۔ شہزادی دل ہی دل میں سوچتی کیونکہ ابھی ایک بار ریڈیو اٹھائے گئے۔ اور وہ ریڈیو لوٹ کر پھر نہیں آیا۔ کتنے دنوں تک تو امی کہتی رہیں کہ کل پرزے اس کے درست ہو رہے ہیں۔ اب یہ کل پرزے درست ہونگے بھی یا نہیں شہزادی جان گئی تھی۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ اندر تخت پر بچھی ہوئی دری اور سوزنی پھٹ پھٹا کر رہ گئی تو قالین ڈرائنگ روم سے تخت تک آ پہنچا۔ اس وقت شبی اور ریحی نے گھر کی رونق اور بڑھا دی تھی۔ اور آج تو یہ قالین بھی ابی کہیں اٹھائے گئے تھے جو تخت سے اٹھایا گیا تھا تو جادو کے قالین کی طرح ہواؤں میں اڑتا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اور امی کو دردِ زہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اور شہزادی نے امی کو ننگے تخت پر سہارا دیکر لٹا دیا تھا اور وہ کراہ کر رہ گئی تھیں۔

گل بوٹے والے اس قالین سے امی کا تصور جانے کیوں شہزادی نے وابستہ کر رکھا تھا۔ اب وہ اپنی امی کو دیکھتی تو بس قالین بیچ میں آ جاتا۔ ایسی پھلواری بیچ میں آ جاتی جس کے پھول کبھی امی کی سیج تھے۔

اسی دن شہلا آنٹی ملنے آئی تھیں تو شہزادی کو بڑا دکھ ہوا تھا۔ دکھ کیا ہوا تھا یوں سمجھو وہ کسی ایسے قصور پر شرمندہ تھی جو اس سے سرزد نہیں ہوا تھا اس نے فوراً کہا تھا "ابی قالین آج ہی ڈرائی کلینگ کو دے آئے ہیں"۔ اور شہلا آنٹی اپنے بابا اور بے بی کی انگلیاں تھامے اس تکلف سے تخت پر ٹک گئی تھیں جیسے بیٹھ نہیں رہی ہوں بلکہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ہوں اور جب ٹنے نے آنٹی کے بابا کو بھینچا تھا تو بابا نے لبورتے ہوئے کہا تھا "چھوڑ بھی

کپڑے گندے ہو جائیں گے۔ اور شہزادی تڑپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے دشمن کی نظر سے دونوں چھوٹے بھائیوں کو گھور کر دیکھا تھا لیکن منے اور ٹنے اس کی برہمی سے بے نیاز تھے۔

امی کو مگر کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ٹنے اور منے کو نہیں ڈانٹتیں۔ شہزادی نے امی کے خلاف سوچا تھا۔ پھر جانے کیوں اس کو اپنی امی پر ترس آ گیا اور وہ وہاں سے کھسک گئی۔ لیکن کمرے میں آئی تو اس کا دوپٹہ اس کی آنکھیں خشک کر رہا تھا۔

شہلا آنٹی کے یہاں جو ادھر کبھی نہیں آتے تھے امی نے بتایا تھا کہ ابی سے عہدے میں کم ہیں۔ تنخواہ میں کم ہیں۔ لیکن اللہ کا دیا سب کچھ ان کے گھر میں تھا۔ آنٹی پہنے اوڑھے رہتیں۔ بچے یوں پوشاک بدلتے جیسے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کا مالک ان کا باپ ہو۔ یوں سوچنا بھی شہزادی کو برا لگتا۔ کوئی سینے میں چٹکی بھر کر کہتا۔ تو کیوں جل رہی ہے۔ اور کہتا بھی کون۔ کہنے والا اس کا اپنا دل ہی تو ہوتا۔

آنٹی بیٹھی امی سے ڈینگیں مار رہیں۔ امی اتنا بڑا سا پیٹ سنبھال کر ہنستی اور بڑھاوا دیتی۔ لیکن شہزادی کو آنٹی کی باتوں کا یہ انداز کھل جانا وہ دل ہی دل میں سوچتی۔ آنٹی جھوٹ کہتی ہیں۔ لیکن نہیں آنٹی نے جھوٹ کب کہا تھا وہ خود دیکھ آئی تھی کہ اُن کے گھر ریڈیو تھا۔ بجلی کا پنکھا تھا۔ پانی گرم کرنے کا ہیٹر تھا۔ بجلی کی استری تھی اسٹوو تھا۔ اور اب۔ اور اب۔ بابا کے ڈیڈی اقساط پر فرج بھی لے رہے ہیں۔ بابا اور بے بی آئس کریم کھائیں گے۔

"کیوں ہے نا نخو؟"

کھاؤ آئس کریم۔ اس میں ہمیں سنانے کی کیا بات ہے بھلا۔ شہزادی جی ہی جی میں راکھ کا ڈھیر بن جاتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی کرید کر چنگاریاں ڈھونڈ رہا ہو۔ دو ہی تو بچے ہیں۔ اس پر آنٹی اتنا اتراتی ہے۔ دونوں اسکول چلے جاتے ہیں تو آنگن سونا ہو جاتا ہے۔ آنٹی یہ کبھی نہیں کہتی۔ ان کے گھر وہ رونق کہاں جو ہمارے گھر ہے۔

تو پھر تو کیوں اسکول نہیں جاتی۔ جا سکتی تو آج کالج میں ہوتی؟ —
اور پھر برسوں ہی تو علی میاں کا نام کٹ گیا۔ فیس ہی نہ دے سکے۔ ولی میاں تنہا تنہا اسکول گئے، کیسے اداس اداس سے۔ اور شبی اور رمی نے تو اسکول کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ تجھے اتنی فرصت کہاں کہ تو انہیں پڑھا لے خیر سے تو نے کچھ پڑھ تو لیا شہزادی۔ گھر کی رونق بڑھانے والوں میں تیرا نمبر چوتھا پانچواں لگتا تو تیرا بھی وہی حشر ہوتا جو شبی اور رمی کا ہو رہا ہے۔ صبح اٹھو تو سونے تک یوں لگتا ہے جیسے ہمارے گھر ہی ساری دنیا سانس لیتی ہے گھر پر گھر کا گمان ہی نہیں ہوتا یوں لگتا ہے، تنگ گلی میں بلوائی گھس گئے ہوں اور سب پکار پکار کر اپنا حق مانگ رہے ہوں۔ اور ابّا — ابّا جیسے کانوں میں انگلیاں دھرے چھپتے پھر رہے ہوں۔ جیسے جیسے سب مانگوں کو پورا کرنا انہیں کا فرض ہے۔ جیسے رزق دینے والا۔ قالین کی پھلواری میں سما کر آسمانوں میں کہیں اڑ گیا ہو۔ اور ابّا اکیلے دنیا بھر کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے ہانپ رہے ہوں۔ اور شہزادی کا جی چاہتا امی سے پوچھے —

امّی تم اتنے ڈھیر سارے بچے کیوں پیدا کئے جا رہی ہو۔ لیکن امی پر اس کو پھر ترس آیا۔ امی ہی سے پوچھ لے۔ تجھ میں ہمت ہے تو امی ہی سے پوچھ لے۔ کوئی اسے اُکساتا۔ اور یہ اکسانے والا کوئی دوسرا نہ ہوتا۔ وہی اس کا ساتھی۔ وہی اس کا دل۔ پھر اس کا ذہن کیسی کیسی باتیں سوچتا۔ ایسی کچھ دبا چلے کہ سب کے سب کون سب۔ وہ خود نہیں۔ امّی نہیں۔ امی۔ شبّی رمّی، سارے کے سارے نام پلک جھپکانے میں اس کے ذہن سے بجلی کی رو کی طرح گزر جاتے اور دبی دبی چیخ اس کی زبان سے نکل جاتی۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں نہیں۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں۔

اور اسے یوں لگتا جیسے وہ اب رو پڑے گی تب رو پڑے گی۔ اور وہ بھاگی بھاگی اپنی امّی کے پاس جاتی۔ امّی اے امّی۔ بستر لگا دوں تم کب تک یوں ننگے تخت پر ——

"ہاں بچھا دے بیٹا۔"

"پھر امّی —— کیا قالین؟"

"آجائے گا۔ سب آجائے گا۔"

اور کچھ ہی دن بعد جب امّی دوا خانے سے دو دھیلی ننھی کو لے کر لوٹیں تو گھر میں خوش آمدید کہنے کے لئے تخت بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اور ادھیڑ ہونے کے سبب امی اس زچگی میں مرتے مرتے بچی تھیں۔ کسی نے ننھی کو دیکھ کر کہا تھا بہت پیسہ خرچ کرا دیا اس نے۔ لیکن دونوں جانیں بچ گئیں —— اللہ کا احسان ہے۔

اور شہزادی نے سوچا۔ قالین کا احسان کیوں نہیں ہے۔ تخت کا احسان کیوں نہیں ہے۔ اور وہ ابھی اپنی اوٹ پٹانگ سوچ کے چکر سے باہر ہی نکلی تھی کہ اسے شہلا آنٹی آتی ہوئی نظر آئیں۔

اس نے لپک کر شبی کو پکڑا۔ گھسیٹ کر کونے میں لے گئی۔ قفل اور کنجی ہاتھ میں تھما کر کہا۔ بھاگ کر دروازے پر تالا ڈال دے اور تو کہیں چھپ رہ۔ شہلا آنٹی آرہی ہیں۔ وہ تالا دیکھیں گی تو لوٹ جائیں گی۔ تب تو نکل آنا، سمجھی —

"سمجھ تو گئی — مگر کیوں ؟"

"اگر مگر چھوڑ بھی اب — سب کچھ بعد میں بتلاؤں گی۔"

اور شبی نگبٹٹ بھاگی، تو شہزادی نے چھوٹے بھائیوں کو منا سمجھا کر کہا کہ کوئی بھی آواز نہ نکالے اور سب کے سب کمرے میں خاموش بیٹھے رہیں۔ بس منٹ دو منٹ کی تو بات ہے۔ پھر وہ انہیں باہر دے گی رکھنے ہوئے تھی تلے ہوئے تھی۔

اور جب سارے بچے کمرے میں جمع ہو کر فرش پر لیٹ گئے تو شہزادی کو یوں لگا جیسے قالین بچھا دیا گیا ہو جس کے پھول مرجھا کر بے رنگ ہو گئے ہیں اور اب یہ قالین اٹھے گا تو دھجیاں دھجیاں ہو کر ہاتھوں سے گر پڑے گا اس نے انجانے میں اپنی امی کو دیکھا۔ جو یوں سیخ ہو گئی تھیں۔ جیسے اٹھنا اُن کے بس میں نہ ہو۔

— سیپ، کراچی

سائے کا سفر

عوض سعید

سہ پہر کی ساعتیں تیزی سے شام کے دھندلکے میں تبدیل ہو رہی تھیں اور فضا میں ایک سوگواری اُداسی رچی ہوئی تھی۔ پوسٹ مین ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتہ سے وہ خط کے انتظار میں اپنی سُدھ بُدھ کھو چکا تھا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر خط نہ آیا تو وہ مر جائے گا۔

اس نے جیب میں سے گولڈ فلیک کی ڈبیہ نکالی اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ اس کے چہرے پر کرب و انتشار کی گہری لکیریں یوں نمایاں تھیں، جیسے وہ غم و اندوہ کی سلگتی ہوئی بھٹی سے ابھی ابھی باہر نکلا ہو۔

ذرا سی آہٹ پر اسے پوسٹ مین کا گمان ہوتا تھا۔ کسی نے سائیکل چلاتے ہوئے گھنٹی بجائی اور وہ دوڑتا ہوا دروازہ تک آیا لیکن وہاں کوئی ناٹے قد کا آدمی کسی احمد رضا کا پتہ پوچھ رہا تھا۔

اس کے منہ میں ابھی تک سگریٹ جل رہی تھی۔ سگریٹ کی آخری پور کو منہ میں دبائے وہ ادھر سے ادھر بے معنی انداز میں ٹہل رہا تھا۔ جب اسکے ہونٹوں

سے سگریٹ کا آخری حصّہ بے طرح چمٹ گیا تو اسے احساس ہوا کہ اسکے ہونٹ لحظہ بہ لحظہ جل رہے ہیں۔ اس نے جھلا کر سگریٹ باہر پھینک دی۔ اور ایک تازہ سگریٹ جلا کر اسی طرح ٹہلنے لگا۔

دور سے خاکی وردی پہنے کوئی بوڑھا ایک زنگ آلود سائیکل پر چڑھا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ دور سے کسی وظیفہ یاب فوجی کی طرح لگ رہا تھا۔

اس نے سوچا، شاید آج بوڑھے کو شام کی ڈاک تقسیم کرنے میں دیر ہوگئی ہو۔ جیسے جیسے وہ قریب آرہا تھا۔ اس کا دل ایک ان جان خوف سے دھڑک رہا تھا۔

پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے خاکی وردی میں ملبوس بوڑھا پوسٹ مین کا روپ دھارے اس کے دروازے پر کھڑا ہے۔

"پوسٹ مین" کسی نے آواز دی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دروازہ کے قریب آیا۔ اس دوران پوسٹ مین خط پھینک کر آگے جا چکا تھا۔

اب اس کے پیروں کے قریب ایک پتلا رنگین لفافہ پڑا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔

"سال گرہ مبارک ہو"

عرشی"

تو گویا آج اس کا برتھ ڈے ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کے ذہن کے سارے

دریچے ایک ایک کر کے کھلنے لگے۔

کسی وقت وہ اپنا بر تھ ڈے بڑے شاندار انداز میں منایا کرتا تھا اس کے وہ قریبی دوست احباب، وہ لڑکیاں جن کا قرب اسے حاصل تھا ہر سال یک جا ہوتی تھیں۔

لیکن وقت کے ناگ کو ڈستے دیر نہیں لگتی۔

حالات سے کہیں زیادہ مزاج کی نرگیت نے اسے بہت جلد اپنے ساتھیوں سے جدا کر دیا اور وہ ریشم کے کیڑے کے مانند اپنے ہی خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ لڑکیاں جو رنگ برنگی تتلیوں کے مانند اس کی شخصیت کا طواف کرتی تھیں ایک خاص موڑ پر پہنچ کر اس سے جدا ہو گئیں۔ لیکن وہ شاکرہ کو اپنی زود آشنا طبیعت کے باوصف بھلا نہ سکا۔ وہ مدت تک اس کے ذہن سے چمٹی رہی لیکن وہ پھر بھی اسے اپنا نہ سکا۔ پھر شاکرہ نے اپنی توہین کا انتقام اس طرح لیا کہ ایک دن اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

جب اسے شاکرہ کے مرنے کی خبر ملی تو وہ مہینوں کھویا کھویا سا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے شاکرہ کو بھی اور لڑکیوں کی طرح اپنے ذہن سے نکال پھینکا۔

آج جب اسے عرشی کا خط ملا تو اسے لگا جیسے وہ عارف نہیں اس کی شخصیت کا کوئی اور روپ ہے۔ عرشی سے ملنا تو کجا اس نے آج تک اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر یہ عرشی کون ہے؟ اس نے سالگرہ کی

مبارک باد اسے کیوں لکھ بھیجی ہے؟

لیکن وہ آج ان باتوں کی تہ میں جانا نہیں چاہتا تھا، وہ اب اپنی عمر کے چالیسویں زینے پر قدم رکھ چکا تھا، جب اس نے مڑ کر ماضی کے چہرے کو دیکھا تو وہاں سوائے زخمی یادوں کے کچھ نہ تھا۔

عرشی کتنا خوبصورت نام ہے۔ کتنی شعریت ہے اس نام میں اسے اچانک یوں لگا جیسے وہ واقعی کبھی عرشی کا محبوب رہا ہو۔

اس نے اپنے ذہن میں عرشی کا ایک خاکہ کھینچا۔ کتابی چہرہ بڑی بڑی خمار آلودہ آنکھیں، پتلے پتلے عنابی ہونٹ، ستواں سی ناک، گھنی سایہ دار پلکیں۔

وہ اس کے زانو پر سر جھکائے لیٹا ہوا ہے۔ وہ اپنی لانبی لانبی خوبصورت انگلیوں سے آہستہ آہستہ اس کے بالوں کی گرہیں کھول رہی ہے۔

کبھی کبھی جھک کر وہ اسے چوم بھی لیتا ہے۔ وہ شرم کے مارے سرخ ہوئی جا رہی ہے، گو اس کی زندگی میں کئی خوبصورت لڑکیاں آئی تھیں، زہت، فرزانہ، طیبہ، شاکرہ ــــ لیکن عشق کی آگ میں جل مرنے سے پہلے وہ اپنی شخصیت ہی کی آگ میں تپ کر کندن ہو چکا تھا۔

آج اسے اپنی زندگی بڑی بکواس لگ رہی تھی۔

چالیس برس یوں ہی گزر گئے اور دس برس یوں ہی گزر جائیں گے۔

پھر ایک دن اسے لوگ اس تنگ و تاریک کمرے میں پھینک آئیں گے جہاں سے آج تک کوئی .....

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔

اس نے خود کو سنبھالنے کی شعوری کوشش کی، مگر لگتا تھا، جیسے کوئی طوفان آنے والا ہے جو اس کی شخصیت کے ہر تار و پود کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔

چالیس برس

چودہ ہزار چار سو دن۔

اور اتنی ہی بدصورت راتیں۔ کیا یہ عذاب جہنم سے کچھ کم ... ہے؟

مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا عرشی راج ہنس کے پروں پر بیٹھی ہوا میں اڑتی ہوئی، اس کی حویلی کے گرد منڈلا رہی ہے، وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں معلق ہیں، مگر عرشی اس کی رسائی سے دور ہے۔

پھر اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے، نہیں نہیں یہ خواب نہیں ہے۔ ابھی تو اس نے نیند کے ماتھے پر سجدہ بھی کیا ہے۔

پھر دفعتاً اس کے کانوں نے موٹر کی گڑگڑاہٹ کی گونج سنی، جیب سے ایک نوجوان گرے کلر کے سوٹ میں ملبوس منہ میں پائپ دبائے، ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتا ہوا اس انداز سے گھر میں داخل ہوا کہ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

—— شبخون، الہ آباد

چاہیئے کہ اردو میں کہانی ابھی اس منزل پر بھی نہیں پہونچی تھی جہاں موپاساں اور چیخوف اُسے لے جا چکے تھے۔ اردو کا یہ روایتی افسانہ اپنی عمر طبعی کو پہونچنے سے پہلے ہی مر چکا ہے، اور جدید افسانہ، جسے اکثر تجریدی اور علامتی افسانوں کے نام بھی دیئے جاتے ہیں اسی نقالی کی منزل سے گذر رہا ہے جس سے کبھی اردو کا روایتی افسانہ بھی گذرا تھا۔ اور برسوں کے بعد وہ اس قابل ہو سکا تھا کہ اپنا الگ مزاج بنا سکے اتنا فرق ضرور ہے کہ پرانے افسانہ نگار جن کی نقالی یا تقلید کرتے تھے اُن کی تخلیقات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ اردو کے بیشتر نئے افسانہ نگار جن ادیبوں کی نقالی کر رہے ہیں یا جن سے متاثر ہونے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اُن کی نگارشات کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم نظر آتے ہیں۔ ادب میں عموماً اور افسانہ میں خصوصاً تقلید یا نقالی سے بات نہیں بنتی۔ افسانہ خواہ پلاٹ دار ہو یا بغیر پلاٹ کا اس کا تانا بانا افسانہ نگار کے تجربہ کی ہی دین ہوتا ہے۔ پھر تجربہ کی ماہیت اور اُس کے اظہار پر افسانہ نگار کی مخصوص شخصیت اور ماحول کی چھاپ ہوتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں جن عوامل کا حصہ ہوتا ہے وہ مختلف افراد میں الگ الگ ہوتے ہیں اس لحاظ سے افراد کی شخصیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ کامو اور سارتر کی تخلیقات میں جن تجربات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ اُن کے اپنے تجربات ہیں اور اسلئے اُن میں خلوص اور صداقت کی گرمی بھی ہے۔ خاص طور پر کامو کی تخلیقات میں دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے دہشت زدہ اور اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرنے کی راہ میں گامزن صنعتی نظام کے کشتہ انسان کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ بظاہر جذبات سے عاری اور غیر ہمدردانہ اسلوب بیان کی تہہ میں کامو کا انسان دوستی کا جذبہ

بدیع الزماں | مٹتے سائے

"سنو ہو جی کوئی آواز دے رہا ہے۔" مولوی اسحاق کی بیوی برآمدے سے چلّا کر بولیں۔ وہ چاول پسار ہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے وہ ہانڈی کو پکڑے ہوئے تھیں۔ رِستے ہوئے پھوڑے کی طرح پیپ کا سا پانی ہانڈی سے نکل کر نیچے پتیلی میں گر رہا تھا۔

"سڑا سا چاول ہے اور ڈیڑھ روپے سیر۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔

مٹی کے چولھے کے ٹھیک اوپر طاق پر ڈھبری رکھی تھی۔ جس کی دھوئیں میں لپٹی ہوئی روشنی سے برآمدے میں مٹیالا اُجالا پھیل گیا تھا۔ سامنے کی کوٹھری میں مولوی اسحاق کے کھانسنے کی آواز رک رک کر لیکن لگاتار آ رہی تھی۔

"اِن کی کھوں کھوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اللہ میاں بھی ایسا مرض غریبوں کو ہی دے ہیں۔" جھلّا کر انہوں نے کہا۔

"مولوی صاحب ہیں؟ مولوی صاحب ہیں؟" باہر سے برابر کوئی آواز دے رہا تھا۔

"ارے سنو ہو کہ نہ، کوئی پکارے ہے دروازے پر۔" مولوی اسحاق کی بیوی

نے پوری طاقت سے چیخ کر کہا۔

"آتا ہوں بھائی۔" مولوی اسحاق کی کھانسی میں لپٹی ہوئی آواز باہر سنائی پڑی۔

"کب سے آواز دے رہا ہے کوئی آدمی۔" مولوی اسحاق کی بیوی نے انھیں کوٹھری سے باہر آتے دیکھ کر کہا۔

مولوی اسحاق ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی دُلائی سنبھالتے ہوئے آنگن میں آئے۔ ان کی سانس بہت پھول رہی تھی اور کھانستے کھانستے ان کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

"کون ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کا معلوم۔ کب سے تو پکار رہا ہے۔"

مولوی اسحاق آنگن پار کر کے دروازے کی طرف چلے گئے، لوٹے تو بیوی نے پوچھا۔

"کون تھا؟"

"اجی وہی تھا کاردھائی کا بیٹا شمسو۔ میلاد کے لئے کہنے آیا تھا۔"

"کب ہے؟"

"آٹھ بجے، آج۔"

"آٹھ بجے، سات تو بج چکے ہوں گے۔ مغرب کی اذان کب کی ہو چکی۔ یہ لوگ ٹھیک وقت پر کیوں بلاتے ہیں۔ پہلے سے کیوں نہیں کہتے؟"

"گیا ہوگا پہلے کریم مولوی صاحب کے پاس۔"

"پھر انھیں کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ یہاں کیوں آگیا۔" مولوی اسحاق کی

بیوی نے غصے میں کہا۔

"ہم لوگوں کی مجبوری کا سب کو علم ہے بھئی۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ دوسرے محلّوں کے لوگ پھر بھی خیال کرتے ہیں۔"

"یہ محلّہ ہے ہی کمینوں کا۔ ایک دو کو چھوڑ کر کون شریف رہتا ہے یہاں۔" مولوی اسحاق کی بیوی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

"اب شریفوں کا زمانہ ہی نہیں رہا۔" مولوی اسحاق حاجی عبدالرحیم کے مکان کو دیکھتے ہوئے بولے۔ اس مکان کا چھوا ڑا ان کے آنگن کی مٹی کی دیوار سے لگا ہوا تھا۔

مولوی اسحاق برآمدے میں آ کر اپنی بیوی کے پاس زمین پر بیٹھ گئے۔

"آج کھانے میں کیا بنا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے کھانا کھا لیا جائے تو دمہ کی تکلیف کم ہوگی۔"

"دال اور سرسوں کا ساگ ہے۔ اپنے لئے ہم نے آج چاول بنایا ہے۔ ولایتی گیہوں کا آٹا کھاتے کھاتے جی اُوب گیا۔"

"چاول کھانے کو تو میرا بھی بہت جی چاہتا ہے۔ لیکن نقصان کرے گا۔"

"ہاں چاول نقصان کرے گا۔ تمہارے لئے روٹی ابھی بن جاتی ہے۔"

"جلدی بنا دو۔ کھا کر ہی جاؤں گا۔ لوٹنے میں دیر ہو سکتی ہے۔"

"بے چاری ماہ رو اندھیرے میں بیٹھی ہے۔ لالٹین لے کر تو میں یہاں آ گیا۔" مولوی اسحاق نے یہ کہہ کر لالٹین ہاتھ میں لی اور کوٹھڑی کی طرف چلے گئے۔

ماہ رو مولوی اسحاق کا گدلا ہاتھ میں لئے چارپائی پر بیٹھی تھی۔ گدلا جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور اس پر جمی ہوئی میل کی موٹی تہہ لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی

دکھائی دے رہی تھی۔ ماہ رو گدلا سینے میں لگ گئی۔

"بول رادھا بول سنگم ہوگا کہ نہیں....." گلی میں کوئی لڑکا فلمی گیت گاتا ہوا گزر گیا۔

مولوی اسحاق نے ماہ رو کو غور سے دیکھا۔ لالٹین کی پھیکی روشنی میں اس کا چہرہ تمتمایا ہوا لگ رہا تھا۔

"شادی کا بندوبست کرنا چاہئے۔" مولوی اسحاق سوچنے لگے۔ مگر دو وقت کی روٹی تو مشکل سے چلتی ہے، بیاہ کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ پھر ڈھنگ کا لڑکا بھی کہیں نہیں ملتا۔ ایک دور تھے آئے بھی تو وہ کسی کام کے نہیں تھے۔ لڑکا اچھا تھا تو ذات ٹھیک نہیں تھی۔ اگر ذات ٹھیک تھی تو لڑکے میں اور کوئی خرابی تھی۔ اپنی پسند کا لڑکا تبھی مل سکتا ہے جب کافی پیسے خرچ کئے جائیں۔ پیسے ان کے پاس کہاں تھے۔ پندرہ بیس سال پہلے کا زمانہ ہوتا تو کیا انہیں کوئی پریشانی ہوتی۔ تب ان کا دم خم کچھ اور تھا۔ عزت پیسہ سبھی کچھ تو تھا ان کے پاس۔

ماہ رو اب آستین سی رہی تھی۔ سیاہ گدلے کی آستین موٹے کالے سانپ کی طرح لگ رہی تھی۔

مولوی اسحاق سوچنے لگے۔ یہ گدلا بہت پرانا ہو گیا ہے۔ پھر بھی سردی سے جتنی حفاظت اس سے ہوتی ہے کسی اور کپڑے سے نہیں۔ "پہلے اس کا کتنا چلن تھا۔" مولوی اسحاق یادوں کی گلیوں میں بھٹکنے لگے۔ امیر، غریب سبھی اس کو پہنتے تھے۔ مگر اب شہر میں تو اسے کوئی بھی نہیں پہنتا۔ اس کی جگہ سوئٹر نے لے لی ہے۔ ان جیسے ہی دو چار لوگ رہ گئے ہیں جو اب بھی اسے پہنتے ہیں۔

"سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔" مولوی اسحاق نے سوچا۔ اور خود وہ کتنے بدل گئے ہیں۔ یکایک ان کی نظر آنگن میں گئی۔ حاجی عبدالرحیم کے دو منزلہ پکے مکان کے ایک کمرے سے آتی ہوئی روشنی سے صحن کا ایک حصہ بھر گیا تھا۔ اس کمرے میں جب بھی روشنی ہوتی، آنگن کا یہ حصہ روشنی سے جگمگا اٹھتا تھا۔ مولوی اسحاق اس روشنی کو اپنے آنگن میں دیکھ کر تلملا اٹھتے تھے۔ ان کا جی چاہتا روشنی کے اس ٹکڑے کو اکھاڑ پھینکیں۔ اسے کبھی اپنے گھر میں نہ گھسنے دیں۔ مگر یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انھیں لگتا حاجی عبدالرحیم کے مکان سے آئی ہوئی روشنی کا یہ ٹکڑا ان کا منہ چڑھا رہا ہے۔ اُن پر ہنس رہا ہے۔ جیسے وہ ان کے گھر کا سارا حال جانتا ہے۔ جیسے اس نے ان کی دُکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ ایسی بات بھی نہیں تھی، کہ حاجی عبدالرحیم سے ان کی دشمنی ہو۔ وہ ان کے ساتھ بہت عزت سے پیش آتے تھے اور آتے جاتے جب بھی دیکھتے تو سلام کرنے میں وہی پہل کرتے۔ وقت پڑنے پر حتی المقدور مدد بھی کرتے تھے۔ حاجی عبدالرحیم کو وہ پچھلے تیس پینتیس برس سے جانتے تھے۔ رحیمو اسے رحیم، پھر رحیم سے استاد اور آخر میں حاجی عبدالرحیم۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری تبدیلیاں مولوی اسحاق کے سامنے ہی ہوئیں۔ اور اب اس کی عزت کے خیال سے اتنا نہیں جتنا اپنی عزت بچانے کی خاطر وہ بھی اُسے حاجی صاحب کہنے لگے تھے۔ کل کی بات لگتی ہے جب وہ ایک سائیکل کے کارخانہ میں آٹھ آنے روز پر مزدوری کرتا تھا۔ پھر رکشے کا کام سیکھ جانے پر اُسے اُس کارخانہ میں پچاس روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی۔ آہستہ آہستہ نے اس نے دو تین سائیکل رکشے خرید لئے۔ اس کے بعد رکشوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اب کچھ بھی نہیں تو سو سوا سو رکشے ہوں گے اس کے پاس۔

روشنی کا ٹکڑا آنگن میں اب بھی چمک رہا تھا، کوڑھ کے سفید داغ کی طرح۔
مولوی اسحاق نے اپنی نظر وہاں سے ہٹالی۔
ماہ رو ابھی آستین کو ہی ٹھیک کرنے میں لگی تھی۔ مولوی اسحاق کو لگا کہ پھٹا ہوا میلا سیاہ گدلا، اور آنگن میں چمکتا ہوا روشنی کا ٹکڑا اُن کی اور حاجی صاحب کی قسمتوں کی کتنی جاندار علامتیں ہیں۔
"بیٹی اب رہنے بھی دو۔ کیوں رات میں آنکھیں پھوڑتی ہو۔ دن میں سی لینا۔"
مولوی اسحاق نے محبت بھرے لہجے میں ماہ رو سے کہا۔
"کام ہی کتنا رہ گیا ہے اب۔ صرف آستین ہی تو رہتی ہے۔" ماہ رو نے جواب دیا۔
مولوی اسحاق نے ٹھنڈی سانس لی۔ خوشی کے دن آنکھ جھپکتے ہی بیت جاتے ہیں، جب کہ مصیبت کی گھڑی کاٹے نہیں کٹتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مولوی اسحاق نے طاق پر سے لال رنگ کا جزدان اٹھایا۔ کھول کر اس میں سے ایک بوسیدہ کتاب نکالی۔ کچھ دیر تک کتاب کو غور سے دیکھتے رہے۔ یہ کتاب ان کے پاس تیس سال سے تھی۔ کتاب کے ورق جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور اس کا کاغذ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ ان کو زبانی یاد تھا۔ میلاد پڑھتے وقت یہ کتاب کھلی ہوئی اُن کے سامنے رکھی ضرور رہتی تھی لیکن اسے دیکھے بغیر ہی وہ اس طرح پڑھتے جیسے دیکھ کر پڑھ رہے ہوں۔ نوجوانی سے بڑھاپے تک کی ہر منزل میں یہ کتاب ان کے ساتھ رہی تھی۔ اس نے ان کے اچھے دن بھی دیکھے تھے اور اب بُرے دن بھی دیکھ رہی تھی۔ مولوی اسحاق کو محسوس ہوا کہ اب تک جتنے میلاد وہ پڑھ چکے ہیں، ان سب کی تصویریں اس کتاب میں محفوظ ہیں۔ میلاد کا ایک جلوس سا ان کے سامنے سے گزر رہا ہے

یہ میلاد ڈپٹی حمید کے لڑکے کے عقیقے کا ہے۔ جس میں چاندی کی طشتریوں میں رومال میں بندھے چار چار لڈو بانٹے جا رہے ہیں۔ یہ میلاد داروغہ احسن علی کی لڑکی کے کن چھیدن کا ہے۔ جس میں شیشے کی طشتریوں میں دو دو امرتیاں میلاد سننے والوں کو دی جا رہی ہیں۔ یہ میلاد احمد پیشکار کے لڑکے کے پاس ہونے کی خوشی میں ہو رہا ہے، جس میں مٹی کی طشتریوں میں جلیبیاں بانٹی جا رہی ہیں۔ اور پھر جلوس کی رونق جیسے گھٹتی جا رہی ہے۔ اب بتاشے بانٹے جا رہے ہیں۔ چینی کے پھر گڑ کے۔ اور اب تو کچھ بھی نہیں ہے سوائے ایک گہرے سناٹے کے۔ جلوس گزر چکا ہے، اس کے ساتھ روشنی، رونق، دھوم دھام سب کچھ جا چکی ہے۔ وہ جلوس سے کٹ کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ جلوس جا چکا ہے۔ وہ اب نہیں لوٹے گا، کبھی بھی نہیں۔

مولوی اسحاق کے سامنے میلاد کی کتاب کھلی رکھی تھی اور بیتے ہوئے دن ابھر ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔

شہر بھر میں اُن کی میلاد خوانی کی دھاک جمی ہوئی تھی۔ میلاد کی محفل میں جب اُن کی آواز گونجتی تو لوگ جھوم اٹھتے۔ خاص طور سے سلام پڑھنے کا انداز اتنا پیارا تھا کہ لوگ چاہتے تھے وہ پڑھتے ہی جائیں جو لوگ میلاد میں نہ آ پاتے وہ بھی سلام کی آواز سنتے ہی ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر دوڑتے بھاگتے وہاں پہنچ جاتے، یہاں تک کہ پڑوس کی عورتیں بھی "حبیب یا حبیب سلام علیک" کی آواز سنتیں تو گھر کا کام دھام چھوڑ کر ادب سے کھڑی ہو جاتیں۔ شہر میں جس طرف سے گزر جاتے لوگ کہتے سنائی دیتے، "اسحاق مولی صاحب جا رہے ہیں۔ بہت خوب میلاد پڑھتے ہیں۔"

کتنا امن چین تھا ان دنوں۔ آئے دن میلاد ہوتے۔ خوشی ہو یا غمی میلاد کا ہونا ضروری تھا۔ سب مولوی اسحاق کو ہی بلانا چاہتے تھے۔ اُن کے انکار کرنے کے بعد ہی کسی اور کو بلاتے تھے۔ خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ جہاں جاتے مرغن غذا کھانے کو ملتی تھی سوالگ۔ زندگی آرام سے کٹ رہی تھی۔

میلاد کے لئے ہی بلاوے اتنے آتے تھے کہ نذر نیاز جیسے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

انسان کی مالی حالت اچھی ہو تو وہ اپنی زندگی کے کچھ اصول بنا ہی لیتا ہے۔ مولوی اسحاق نے بھی کچھ اصول بنا رکھے تھے۔ چالیسویں کے میلاد کے موقع پر مرے ہوئے آدمی کے کپڑے اُن کو دستور کے مطابق دیئے جاتے تو وہ کبھی نہ لیتے کہتے کہ اسے یتیم خانے میں بھجوا دیجئے یا غریبوں کو دے دیجئے۔ داروغہ بشیر کے چالیسویں میں ایک سینی میں رکھ کر کتنے قیمتی کپڑے ان کے سامنے لائے گئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے ان کا ایمان ڈگمگایا بھی تھا۔ شیطان اُن کے کان میں پھونک رہا تھا۔ ایسے موقعے بار بار نہیں ملتے۔ انہیں رکھ لو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے کمزوری پر قابو پا لیا تھا۔ شیطان بھاگ گیا تھا۔

دراصل مردوں کے کپڑے دیکھ کر انہیں بے حد نفرت ہوتی تھی۔ دوسرے میلاد خوان تو ایسے موقعوں کے انتظار میں رہتے تھے۔ چالیسویں کے میلاد کی بھی تو خاص بات تھی۔ میلاد کی فیس کے علاوہ مرحوم کے کپڑے وغیرہ بھی ملجاتے تھے۔

مگر شیطان نے اب تو اُن کے دل میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ مولوی اسحاق نے سامنے ٹنگی ہوئی شیروانی کو دیکھ کر سوچا۔

یہ گندی سوتی شیروانی اُن کو شبراتی میاں، راج کے چالیسویں میں ملی تھی۔ اسے پہن کر وہ یہی محسوس کرتے تھے جیسے وہ اب زندہ نہیں رہے، جیسے وہ چلتی پھرتی لاش ہوں شبراتی میاں کی۔ جیسے یہ شیروانی نہ ہو کوئی کفن ہو جس میں انہیں لپیٹ دیا گیا ہے۔

مولوی اسحاق کی آنکھوں میں شبراتی میاں کے چالیسویں کا منظر گھوم گیا۔ میلاد کے بعد جب شیروانی ان کے سامنے رکھی گئی تو وہ اسے دیکھ کر کانپ اٹھے تھے۔ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے انہیں وحشت ہو رہی تھی۔ جیسے یہ شیروانی نہ ہو کوئی زہریلا سانپ ہو جو چھوتے ہی انہیں ڈس لے گا۔ جمعہ کی نماز اور عید، بقرعید کی نمازوں میں انہوں نے شبراتی میاں کو نہ جانے کتنی بار اس شیروانی میں دیکھا تھا لیکن ان کے پاس کوئی شیروانی نہیں تھی۔ اور انہیں ایک شیروانی کی سخت ضرورت تھی۔ اپنے دل کی ہلچل پر قابو پا کر انہوں نے یہ شیروانی اپنے پاس رکھی تھی۔ لیکن جب ان کی نظر شبراتی میاں کے بیٹے پر پڑی تو انہیں لگا کہ واقعی کسی زہریلے سانپ نے انہیں ڈس لیا ہے اور اس کا زہر تیزی سے اُن کے بدن میں پھیل رہا ہے۔ اس کی نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں: "ہم نے تو یہ سمجھ کر شیروانی آپ کے سامنے رکھی تھی کہ آپ اسے قبول نہیں کریں گے۔ کیونکہ آپ مردوں کے کپڑے نہیں پہنتے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اسے نہیں لیں گے۔ اور مرحوم باپ کی یہ شیروانی میرے کام آجائیگی"۔

ایک لمحے کے لئے اُن کے دل میں آیا کہ شیروانی لوٹا دی جائے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اور اس کا لوٹنا اب ممکن نہیں تھا۔

اور اس کے بعد وہ میلاد میں مردوں کے کپڑے بھی خوشی سے قبول کرنے لگے

تھے۔ مگر اب مُردوں کے کپڑے دینے والے بھی نہیں تھے۔ مہنگائی نے سب کی کمر توڑ دی تھی۔ مُردوں کے کپڑے اُن کے گھر والے ہی پہن لیتے ہیں۔ مولوی مُلّا کو کون دیتا ہے۔

آنگن میں حاجی عبدالرحیم کے مکان سے آئی ہوئی روشنی کا ٹکڑا اب بھی چمک رہا تھا۔ کوڑھ کے سفید داغ کی طرح۔

"میرے مولا بلا لو مدینے مجھے"۔ گلی میں ولی محمد درزی کی آواز سنائی دی۔ وہ دکان سے لوٹ رہا تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہوئے ہر روز اس کی یہ آواز سنائی دیتی۔ پھر اس کی آواز آئی "مولی صاحب سلام علیکم"۔

"وعلیکم سلام خلیفہ"۔ مولوی اسحاق نے جواب دیا۔

"سب خیریت ہے نا مولی صاحب۔ آج کارو قصائی کی بیوہ کا جالیواں ہے نا مولی صاحب۔ اس لئے دکان جلدی بند کر دی۔ بڑی نیک عورت تھی بیچاری۔ شوہر کے مرنے کے ایک سال کے اندر ہی اندر خود بھی چل بسی خدا جنت میں جگہ دے اس کو"۔

"ہاں بھائی اللہ سب کے گناہوں کو بخشنے والا ہے، بڑا رحیم ہے"۔ مولوی اسحاق بولے۔

"آپ آئیں گے نا مولی صاحب"۔ ولی محمد نے پوچھا۔

"ہاں بھئی وہیں جا رہا ہوں"۔

"اچھا مولی صاحب سلام علیکم"۔ ولی محمد یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

بے چارہ کتنا نیک ہے۔ مولوی اسحاق سوچنے لگے۔ اب ایسے سیدھے سادے لوگ کہاں رہے۔ پہلے اس کا دھندا بھی کتنے مزے سے چل رہا تھا۔ مگر بڑھتی ہوئی

باطنی لہر کی طرح جاری و ساری نظر آتا ہے۔ دی آؤٹ سائیڈر ہو یا دی فال، دی پلیگ ہو یا دی ریبیل ہو۔ کوئی کور چشم ہی ان میں اس انسان دوستی کی جھلک دیکھنے سے قاصر رہیگا جو ان تخلیقات کی محرک رہی ہے۔ ان میں نہ تو وہ جھنجلاہٹ کی کیفیت ملیگی اور نہ ہی وہ پاگلوں کی بڑ جو تجریدی اور علامتی افسانوں کے نام سے اردو میں شائع ہونے والی تحریروں میں ہمیں آج اکثر و بیشتر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان نام نہاد تجریدی افسانوں کے مصنف بھی دراصل قابل معافی ہیں کیونکہ وہ خود یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں لیکن زیادہ حیرت اردو کے ان ناقدین پر ہوتی ہے جو اس رطب و یابس کا رشتہ کامو اور سارتر جیسے بلند پایہ فنکاروں کے افکار و خیالات سے جوڑتے ہیں۔ ممکن ہے مستقبل میں ایسے افسانہ نگار سامنے آئیں جو کامو اور سارتر کی طرح اردو افسانہ کو فن کی نئی سمتوں اور جہتوں سے روشناس کرائیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت تک کامو اور سارتر کا فن بھی پرانا نہیں پڑ جائیگا۔ ٹھیک جس طرح موپاساں اور چیخوف کا فن آج فرسودہ ہو چکا ہے۔

اس جائزے سے یہ ظاہر ہوگا کہ گذشتہ تیس پینتیس سال کے عرصہ میں اردو افسانے نے جو ترقی کی ہے وہ بہت امید افزا نہیں ہے۔ آج کہانی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مغرب میں بھی روبہ زوال ہے۔ ایسی صورت میں ایک سال کی مختصر مدت میں شائع ہونے والے افسانوں میں سے اچھے افسانوں کا انتخاب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی یہ جسارت کی گئی ہے۔ افسانوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مختلف رجحانات کی نمائندگی حتی الامکان ہو سکے۔ اس انتخاب میں آپ کو ایسی کہانیاں بھی ملینگی جو بڑی حد تک روایتی ہیں۔ اور ایسی کہانیاں بھی جو نئے آہنگ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

مہنگائی اور بدلتے ہوئے فیشن نے اس کی کمر بھی توڑ دی ہے نئے فیشن کے سوٹ اور کپڑے سلوانے کے لئے لوگ ویسٹرن ٹیلرنگ شاپ اور ریڈیمیڈ فیشن ایبل دکانوں میں جاتے ہیں۔ بے چارے ولی محمد خلیفہ کے پاس تو اب گاؤں کے چند لوگ ہی آتے ہیں۔ بیٹے سب نالائق نکلے۔ سب نے اپنی بیوی کے ساتھ الگ گھر بسا لیا ہے۔ چھوٹا صرف ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غریب کے دن مصیبت میں کٹ رہے ہیں۔ مولوی اسحاق کو یکایک محسوس ہوا کہ اُن کی اور ولی محمد کی کہانی بالکل ایک سی ہے۔ دونوں ہی پرانے ہو چکے ہیں۔ دونوں ہی نئے زمانے کے لائق نہیں رہے۔ اُن کی نظر آنگن میں پڑے ٹین کے ٹوٹے ہوئے بکس پر پڑی، جس کے زنگ خوردہ حصے حاجی عبدالرحیم کے مکان سے آئی ہوئی روشنی میں انگیزیا کے دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

"آوارہ ہوں، آوارہ ....." گلی میں سے کوئی لڑکا فلمی گیت گنگناتا ہوا گزر گیا۔

اب لوگ فلمیں زیادہ دیکھتے ہیں۔ میلاد کرانے والے تو اللہ کو پیارے ہو گئے، بھولے بہت لوگ جو زندہ ہیں اُن کی حالت اتنی خستہ ہے کہ میلاد کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ اور جو لوگ کراتے بھی ہیں وہ پہلے مولوی کریم کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

دمہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی نے اُن کے کاروبار کو ٹھپ کر دیا ہے۔ وہ سوچنے لگے۔

اُن کی آواز میں پہلے کا سا دم خم نہیں رہا۔ کھانسی کے دورے سے میلاد کا مزا کرکرا ہو جاتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ گھنٹوں اُن کی تقریر سنتے اور کیا مجال کہ اُن کا جی اُوب جائے۔ مگر اب تو لوگ بیتابی سے سلام کا انتظار کرتے رہتے تھے سلام کے ختم ہوتے ہی وہ اس طرح بھاگتے جیسے بچے اسکول سے چھٹی ہونے پر بھاگتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے انھیں لوگ "کھوں کھوں" مولی صاحب کہنے لگے تھے۔

اللہ کی راہ میں دو بھیّا۔ اللہ کے نام پر ایک پیسہ۔ اللہ برکت دے گا۔ روزی میں اولاد میں۔ ساب (ثواب) ہوگا بھیّا۔ گلی میں پچیہ بھکارن آواز لگا رہی تھی اسکی آواز روز سویرے شام گلی میں گونجتی تھی۔ لیکن آج اس آواز میں مولوی اسحاق کو بڑا درد محسوس ہوا۔ اس سے پہلے نہ معلوم کتنی بار پچیہ کو دیکھ کر یا اس کی آواز سن کر ان کے دل میں خیال آیا تھا کہ پچیہ کی حالت اس کے گناہوں کا اُس کے اپنے کئے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس وقت ایسا کوئی خیال اُن کے دل میں نہیں آیا۔ اس وقت اس کی آواز سن کر ان کا دل نہ جانے کیوں تڑپ اٹھا۔ پچیہ کی جوانی کی تصویر ان کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ رنگ سانولا تھا۔ مگر ناک نقشہ اتنا اچھا تھا کہ لوگ جان چھڑکتے تھے۔ اس کی شادی کسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ لیکن شوہر سے ایک دن بھی نباہ نہ ہو سکا۔ سسرال سے لڑ جھگڑ کر جو آئی تو آج تک وہاں کا رخ نہیں کیا۔ بڑی طرح دار عورت تھی۔ ان دنوں محلّے میں دل والے لوگ بھی تھے اور گانٹھ میں پیسہ بھی تھا۔ ان کی لاڈلی بن کر خوب عیش کرتی تھی۔ داروغہ بشیر کی تو منظورِ نظر تھی۔ محلّے کے لوگ پچیہ کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر داروغہ بشیر کا ایسا دبدبہ تھا کہ کیا مجال جو کوئی ایک حرف بھی زبان پر لا سکے۔

"کبھی اس بے چاری کے بھی دن تھے" مولوی اسحاق نے سوچا۔

ایک عجیب نامعلوم اور پُراسرار ڈھنگ سے ان کے من میں پچیہ کے لئے ہمدردی کا احساس ابھر رہا تھا، اور پھر یکایک انھیں لگا کہ پچیہ اور ان کی حالت میں رتی بھر کا بھی تو فرق نہیں ہے۔ جیسے دونوں ہی ایک ڈوبتی ہوئی ناؤ پر سوار ہیں۔

"اللہ روزی میں برکت دے گا....." پچیہ کی آواز اب ان کی کھڑکی کے قریب سے آرہی تھی۔ انہوں نے سیلاد کی کتاب جزدان میں رکھ دی، تکیہ کے نیچے سے دس پیسہ کا سکہ نکالا اور کھڑکی سے پچیہ کی جھولی میں ڈال دیا۔

"اللہ بھلا کرے آپ کا مولی صاحب، روزی اولاد سے خدا خوش رکھے آپ کو" پچیہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

مولوی صاحب کھڑکی کے پاس کھڑے رہے۔

لوگ باگ اپنے کام دھندوں سے لوٹ رہے تھے۔ راج، مزدور، درزی دن بھر کی محنت کے بعد تھکے تھکے قدموں سے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے جو بھی گزرتا مولوی اسحاق کو کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھ کر "سلام مولوی صاحب" کہتا اور آگے بڑھ جاتا۔

لوگ اب بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس خیال سے ان کے دل کو سہارا ملا۔

گلی کے اس سرے پر حاجی عبدالرحیم کے مکان کے صدر دروازے کی پیشانی پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں کئی لڑکے گولی کھیل رہے تھے۔ ننگے پیر، میلے کچیلے کپڑے، بہتی ہوئی ناک اور انھیں لگا کہ رحیمو ابھی ابھی رکشے کے کارخانے سے کام کر کے لوٹا ہے۔ اس کے بدن پر میلی قمیص ہے اور ایسا ہی گندا نیکر ہے، اس کے بال دھول

میں اٹے ہوئے ہیں اس کے بدن سے وارنش، موبل اور مٹی کے تیل اور نہ معلوم کس کس چیز کی بدبو آرہی ہے۔ وہ گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ گندی گالیاں بک رہا ہے۔ کسی لڑکے نے اسے زمین پر دے مارا ہے۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ سا چھوٹ پڑا ہے۔ اس لڑکے نے اسے دونوں ہاتھوں میں دبا رکھا ہے اور اسے اپنا تھوک چاٹنے کو کہہ رہا ہے.... اور.....

..... بمبئی میل گیا اسٹیشن پر آکر رک گیا ہے۔ حاجی عبدالرحیم گاڑی کے ڈبے سے اتر رہے ہیں۔ محلے بھر کے لوگ، عبدل قصائی، ولی محمد خلیفہ صبدل راج اور نہ جانے کون کون اسٹیشن آئے ہیں ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ دن بھر کی محنت سے ان کا جسم تھکا ہوا ہے۔ لیکن صبح چار بجے ہی پھولوں کی مالا لے کر وہ سب حاجی عبدالرحیم کا استقبال کرنے کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔ وہ حج کر کے لوٹے ہیں۔ کالی کملی والے کی اس پاک زمین کو دیکھ کر لوٹے ہیں، جس کی زیارت استقبال کی خاطر آئے ہوئے ان لوگوں کو کبھی نصیب نہیں ہوگی۔ ولی محمد خلیفہ کو بھی نہیں، جس کی زبان پر ہر لمحے یہی رہتا ہے "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے"۔ اور مولوی اسحاق کو بھی نہیں جو پینتیس سال سے مدینے کی گلیوں اور کالی کملی والے کے گن گاتے آئے ہیں۔

رات کے ساڑھے دس بجے جب مولوی اسحاق لوٹے تو ان کے ہاتھ میں بتاشے کے دونے کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی گٹھڑی بھی تھی۔ ماہ رو سو چکی تھی، لیکن مولوی اسحاق کی بیوی جاگ رہی تھی۔ انھوں نے ڈرتے ڈرتے گٹھڑی کی گرہ کھولی۔ کپڑے کی تہہ اٹھا کر دیکھا تو ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

کا رد قصائی کی بیوی کی دو ساڑھیاں رکھی تھیں، بالکل سفید، مردے کے کفن کی طرح سفید۔ مولوی اسحاق نے اپنی بیوی کے سفید پڑتے ہوئے چہرہ کو دیکھا تو انھیں ایسا لگا جیسے سچ مچ وہ بیوہ ہو چکی ہوں۔

اور تب ان کی نظر آنگن میں گئی، جہاں حاجی عبدالرحیم کے مکان سے آئی ہوئی روشنی کا ٹکڑا اب بھی چمک رہا تھا۔ کوڑھ کے سفید داغ کی طرح۔

—— آجکل، دہلی

ویریندر | تلاش

اس دن میں نہ جانے کس بات کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا تھا۔ دفتر کی چھٹی تھی۔ اور میں اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میری پریشانی میں اس خیال نے اور اضافہ کر دیا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں میں ایک دم تنہا ہوں۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارا جا سکے۔ کمرے کی دیواریں میری ہی طرح خاموش تھیں اور جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا پلاسٹر اس بات کا ثبوت تھا کہ انھوں نے بھی میری ہی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی ان گنت چیزوں کو خود سے کاٹ کر پھینک دیا تھا میں بھی تو یہی کر رہا تھا۔ میں دیواروں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان کی طرح ذہن کے کسی گمنام گوشے سے انگڑائی لے کر اٹھا اور رفتہ رفتہ مجھ پر چھا سا گیا۔ اس کا نام ظاہر کرنا قطعی ضروری نہیں ہے۔ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح سادگی پسند اور کسی حد تک خوبصورت کہی جا سکنے والی لڑکی تھی۔ نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا حتیٰ کہ اس کا وجود بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ممکن ہے کہ اسے پسند کرنے کی

جو وجہ میں بیان کروں، اس میں کسی دوسرے کو قطعی دلچسپی نہ ہو۔ لہٰذا وہ صرف میرے لئے اہمیت رکھتی ہے۔ میں نے چاہا کہ میں اس کے متعلق قطعی نہ سوچوں، مگر یہ سب میرے بس کے باہر تھا۔

کئی برسوں تک میں اس سے روزانہ ملتا رہا، مگر میں اس پر یہ کبھی ظاہر نہ کر سکا کہ وہ میرے دل و دماغ میں کیا مقام حاصل کر چکی ہے۔ شاید آگے بھی میں یہ اس پر کبھی ظاہر نہ کر سکوں۔ کبھی کبھی میں نے سوچا ہے کہ وہ میرے خیالات و جذبات سے ایک دم ناواقف تو نہیں ہو سکتی۔ مگر میں اپنے اندازہ کی حقیقت جاننے کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھا سکا۔ ان گنت نظمیں میں نے اس کے بارے میں لکھیں اور اسے سنائیں بھی، مگر میں یہ نہیں کہہ سکا کہ ان سب کے پس پردہ صرف وہی تھی۔ صرف وہی۔ وہ ان نظموں کو بغور سنتی رہی، شاید وہ سوچتی رہی ہوگی کہ میں کتنا ذہین ہوں، میرے دل میں کتنا درد و خلوص ہے۔ اسے اس بات کی خبر تک نہ ہوگی کہ اس انٹلیکچوال سنابرمی کا مرکز کون ہے۔

جی چاہا کہ ایک بار اپنے لڑکپن پر ہنسوں، اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ آدمی کچھ نہیں ہے، اسے کنٹرول کرنے والا کلچ تو کسی دوسرے کے ہاتھوں میں ہے، یہ تو محض اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ یہ تنہا کچھ بھی نہیں ہے.... تو کتنا تعجب ہوگا انھیں۔ ارے! ہم تو اسے نہ جانے کیا کیا تصور کرتے رہے! یہ تو وہی نکلا، اپنوں میں سے ایک! تو کیا میں اتنے دنوں تک کوئی غیر معمولی شخص تصور کیا جاتا رہا ہوں۔ شاید ایسا ہی ہو

شاید ایسا نہ بھی ہو۔ کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ تو کسی کا غیر معمولی ہو جانا کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ ہی کسی کا معمولی بنے رہنا۔ میں گھبرا گیا۔ یعنی کوئی چیز بھی معنی نہیں رکھتی، سب کچھ بے معنی ہے۔ میں ـــ وہ ـــ یہ شہر ـــ وہ شہر ـــ تمام شہر ـــ تاہم کوئی چیز تو ایسی ہو گی جو بامعنی ہو۔ شاید وہ کبھی ختم ہو چکی ہے اور اب صرف ایک تواریخ رہ گئی ہے۔ معنی کی تواریخ۔ بڑا اچھا موضوع ہے۔ اس پر تو ایک خوب صورت نظم لکھی جانا چاہئے۔ مگر کیا فائدہ۔ یہ نظم بھی معنی کی تواریخ کی مانند لایعنی سمجھی جائے گی۔

مگر یہ معنی والا سلسلہ شروع کیوں کر ہو گیا تھا۔ کمرے کی اشیاء میں کوئی بھی تو ایسی نہیں تھی جس کی بنا پر میں غیر شعوری کیفیت میں ہی اس رو میں بہہ نکلتا۔ کمرے میں موجود اشیاء کا معائنہ کرنے پر میں پہلی دفعہ اس حقیقت سے دوچار ہوا کہ کمرہ کوئی خاص نہیں تھا۔ سامان کوئی خاص نہیں تھا، اور آس پاس رہنے والے لوگ میری ہی طرح بے وجہ جی رہے تھے۔ اتنے سارے لوگوں کے زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہیں، اتنے سارے لوگوں کے مر جانے کا بھی کوئی مقصد نہیں، کہیں کوئی مقصد نہیں۔ سب کچھ بے مقصد ہے۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ میں ایک عجیب سا سلسلہ شروع کر چکا تھا۔ میں یکے بعد دیگرے تمام الفاظ کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دینے کے موڈ میں آ چکا تھا۔ دھیرے دھیرے میں ساری لغات کے اوراق پھاڑ کر پھینک دینے والا تھا۔ کوئی بھی لفظ باقی نہیں رہنے والا تھا۔ کیونکہ میں کسی بھی لفظ کا وجود ثابت نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک سکوت قسطوں میں بڑھتا چلا جاتا۔ ہر سمت خاموشیاں رہ

جاتیں۔ ہم لوگ صرف اشاروں میں بات کرتے، پھر اشارے بھی ختم ہو جاتے ہم لوگ صرف اپنے آپ میں گم ہو کر رہ جاتے۔ زمین کی سطح پر کوئی زندگی نہ رہتی پھر..... ایک انتظار بھرا سناٹا چھایا رہتا۔ پھر..... پھر کچھ ہل چلیں شروع ہوتیں۔ زمین سب کچھ اگلنے لگتی۔ آدمی، عورتیں، مکان، کارخانے سڑکیں، شہر، سینما سب کچھ۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوتا۔ میرا کمرہ بھی ہوتا۔ میرا شہر بھی ہوتا، اور وہ بھی ہوتی، اس کا شہر بھی ہوتا، بڑا دلچسپ سلسلہ تھا۔ کاش! اگر ایسا ہو سکتا۔

میں جانتا تھا ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا اور اگر میں کمرے میں بیٹھا ہوا یوں ہی سوچتا رہتا تب تو شاید قطعی نہیں۔ میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ کمرے سے باہر نکل کر شہر کی بھیڑ میں کھو جاؤں۔ اس کا ایک حصہ بن جاؤں تالا لگا کر جب میں نے سڑک پر پہلا قدم رکھا، تب ہی میں اس راز سے واقف ہو گیا، کہ میں نے کوئی عقل مندی کا کام نہیں کیا تھا۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ کمرے میں گھٹتے رہنا بھی تو کوئی عقلمندی کا کام نہیں تھا یہاں کھلا آسمان تھا، کھلی ہوئی سڑکیں تھیں اور اتنے سارے لوگ تھے۔ میرے خیالات اور زیادہ جگہ گھیر سکتے تھے۔

میں یوں ہی چلتا رہا۔ شاید کسی جگہ میں رُکا بھی تھا۔ ہر ایک سڑک میری دیکھی ہوئی تھی، ہر ایک دکان میری جانی پہچانی تھی اور تمام لوگ جن کے ناموں سے شاید میں واقف نہیں۔ بالکل میرے اپنے تھے۔ ایک طرح سے میں ہر جگہ خود کو دہرا رہا تھا اور حاصل کچھ نہیں تھا۔ تبھی میں نے جان لیا کہ میں

اور نئی سمتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انتخاب میں شمولیت کی بنیاد افسانہ رہا ہے، افسانہ نگار کا نام نہیں۔

اس انتخاب میں بلاشبہ کچھ خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ ممکن ہے ایسے کئی افسانے جو اس انتخاب میں شامل کئے جانے کے مستحق تھے شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔ اس کی ایک وجہ ضخامت کی مجبوری بھی رہی ہے۔ ضخامت میں مزید اضافہ ممکن نہیں تھا۔

یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ اور ہر سال افسانوں کا ایک نمائندہ انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔

نئی دہلی

بدیع الزماں

اس شہر سے اکتا گیا تھا اور شاید وہاں سے بھاگ جانے کا خواہش مند تھا۔ مگر بھاگنا تو بزدلوں کا کام ہے..... میں بھی تو بزدل ہوں۔ میں بھی تو ہر جگہ سے بھاگتا رہا ہوں کہ شاید آگے کچھ اور ہو۔ ماں کے پیٹ سے بچپن کی طرف، بچپن سے جوانی کی طرف۔ چلو تو پھر یہاں سے بھی یہی سہی۔ مگر بھاگ کر جاؤں کہاں؟ اور کیا ضروری ہے کہ جہاں میں جاؤں، نوکری میرا انتظار کرتی ہوئی ملے۔ نوکری کا مسئلہ بھی تو آج اہم ترین مسئلہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو میں کب کا دنیا کی سیر پر جا چکا ہوتا۔ ایک دم پیدل جس شہر میں جاتا نوکری ملتی، رات کسی ہوٹل میں سوتا، صبح کہیں اور ناشتہ کرتا۔ دوپہر کسی اور مقام پر گزرتی، شام کسی تیسرے شہر میں ڈھلتی۔ نہ جانے کتنے لوگوں سے ملاقات ہوتی اور میں انھیں اپنے ملک کے لوگوں کے متعلق بتلاتا، یہاں کے رسم و رواج اور تہواروں کے متعلق بتلاتا۔ غرض کہ سارے ہندوستان کے متعلق بتلاتا۔ نہ جانے کون کون سے مناظر دیکھنے کو نصیب ہوتے، نہ جانے کون کون سے واقعات اپنے ساتھ پیش آتے۔ زندگی کی تمام تلخی اور کسیلاہٹ ختم ہو جاتی۔ مگر ایسا تھا تو نہیں، ابھی تو میرے سامنے صرف ایک شہر کا مسئلہ تھا، جس سے میں اکتا چکا تھا اور جہاں سے میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی ضرورت کیوں تھی؟ کیا میں اس لڑکی کی کمی اتنی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہیں یہ بات تو نہیں کہ میں خود کو ہمیشہ اس لمحے سے دوچار ہونے سے دور رکھنا چاہتا ہوں، جو کہ مجھے اس کی یاد دلاتا گزرے؟ تب تو یہ ایک معمولی سی بات تھی اور اتنی محنت سے ترتیب دیے گئے یہ خیالات محض خود کو خود سے دور

رکھنے کے بہانے تھے۔ میں نے خود کو ڈانٹا ۔ اگر تم میں اتنی ہمت نہیں تو اس لڑکی کو فراموش کیوں نہیں کر دیتے؟ اس طرح جال پھیلانے کی کیا ضرورت یوں تو تم خود سے نہ جانے کتنی دور نکل جاؤ گے اور تمہیں مخاطب کرنے والی ہر آواز شکستہ ہو کر دم توڑ دے گی، جاؤ اور اسی وقت اس سے کہو کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں..... مگر یہ کیسے ممکن تھا اس کے اور میرے درمیان کئی میلوں کا فاصلہ تھا بلکہ کئی صدیوں کا فاصلہ تھا۔

میں نے مسکرا کر دل سے کہا۔ جب کوئی کام نہ ہو تو تمہیں بیکار کی سوجھتی ہے۔ کاش تم میں بھی ایک چھوٹا سا دماغ فٹ ہوتا اور تم مناسب صلاح دے سکنے کے لائق سمجھے جا سکتے..... اب میں اس ذکر سے کافی دور نکل آیا تھا اور اس وقت ریلوے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ یکایک ہی میں نے جانا تھا کہ کوئی ٹرین آئی ہے اور مسافر ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے نکلنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ مبادا اس وقت کوئی ٹی آجائے!.... ہوں ہوں..... دیکھا جائے گا..... میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دوپہر کب کی سرک گئی تھی..... ارے اتنی جلدی اتنا وقت کیسے گزر گیا؟..... کسی نے کہا تھا، بیٹا! اسی طرح عمر تمام ہو جائے گی اور تمہیں خبر تک نہ ہوگی۔ خیر وہ تو سب بعد کی باتیں ہیں۔ ان سب سے بعد میں نبٹیں گے..... لیکن میں ریلوے اسٹیشن کیوں چلا آیا؟ کہاں جانا ہے مجھے؟..... بھول گئے، تم ابھی شہر سے کھاگنے کا ارادہ کر رہے تھے..... معاف کرنا پارٹنر..... اور میں یہ جانے بغیر کہ ٹرین کہاں جانے والی ہے اس میں سوار ہو گیا۔

یہ ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ تھا اور میں یہ دیکھ کر مایوس بھی ہوا کہ میرے سوا وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اکثر تو ایسا نہیں ہوتا۔ آج کیا بات ہے؟..... تمہارے لئے خالی پڑا ہے، کیا کہنا ہے میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا، ہلکی سی تاریکی کی چادر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں یوں ہی سر باہر نکالے ہوئے پانی کی ننھی ننھی بوندوں کو اپنے چہرے پر پھیلنے کا موقع دیتا رہا نہ جانے کتنی دیر تک میں یہی کھیل کھیلتا رہا، اس درمیان میں، میں ان تمام باتوں کو فراموش کر چکا تھا، جن کے ذریعے میں اسٹیشن تک پہنچا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں بھی ایک ہلکا سا اندھیرا چھا گیا تھا۔ کمبختوں نے بجلی بھی نہیں جلائی تھی میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ رنگزین مڑھی ہوئی صوفے نما کرسیاں، لکڑی کی دیواریں، چھت پر پنکھا اور بلب جیسی بے مصرف چیزیں۔ میں نے پیشاب خانے کا دروازہ کھولا اور پیشاب کرنے کے ارادے کے تحت پتلون کے بٹن کھولنے لگا۔ میری نگاہیں آئینہ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں، بیس بائیس سال کا دھندلا سا نوجوان چہرہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ مسکراتا ہوا، اتنا خوبصورت تو میں کبھی نہیں رہا..... پھر یہ کیا ہے؟ کوئی اور دھوکا؟..... میں کسی ایسی چیز کی تلاش کرنے لگا، جس سے آئینے کو توڑا جا سکتا، کوئی چیز نہیں ملی۔ ہار کر میں بغیر پیشاب کئے ہی پھر سے صوفے میں آدھنسا مجھے پورا یقین تھا کہ میرے پاس کوئی پتھر موجود رہا ہوتا تو میں اس آئینے کو توڑ کر ہی دم لیتا، یا کوئی بلیڈ ہی رہی ہوتی تو کم از کم اس رنگزین کو تو کاٹا

ہی جا سکتا تھا۔ بہت سے کام ہو سکتے تھے۔ مثلاً۔ بلب کو پھوڑ دینا، پنکھے کو نقصان پہنچانا، پیشاب خانے کی دیواروں پر گالیاں لکھ دینا وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں ایک شریف آدمی کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور بڑھتی ہوئی تاریکی کو گھورتا رہا۔

کاش! میرے علاوہ اس کمپارٹمنٹ میں دوسرا بھی ہوتا..... اگر وہ لڑکی ہوتی تو!..... آخر تم ہاتھ دھو کر اس لڑکی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟..... چپ..... ایک لاجواب چپ..... تبھی بتی جلی اور میں نے محسوس کیا کہ کئی دنوں تک تاریک وادیوں میں بھٹکتا پھرنے کے بعد میں پھر سے شہر میں آ گیا ہوں..... ٹرین کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی اور آخر کار وہ رک گئی۔ میں کمپارٹمنٹ سے باہر نکلا اور اسٹیشن کا نام پڑھنے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھنے لگا..... ایک جانا پہچانا اسٹیشن تھا، جہاں میں پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا میں اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ کسی نے مجھ سے ٹکٹ کے متعلق پوچھ تاچھ نہیں کی۔ گیٹ پر شاید کوئی تھا ہی نہیں۔ ویسے مجھے پورا یقین تھا کہ آج میرے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آنے والا ہے۔ سو میں مطمئن بھی تھا۔

میں بڑھتا چلا گیا۔ یہ اسٹیشن ایک چھوٹے سے گاؤں کی نمائندگی کرتا تھا، جو کہ محض چند آثارِ قدیمہ کی موجودگی کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ ویسے یہ بات اور تھی کہ اس دن ٹرین سے وہاں اترنے والا میں واحد مسافر تھا..... یہ ایک چھوٹی سی چائے کی دکان تھی، کچھ کرسیاں

باہر بچھا دی گئی تھیں۔ جن پر چند لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں انہی کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک چائے کا آرڈر دے کر سونی نگاہوں سے خلاؤں میں تاکنے لگا۔ میں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے آدمی کی حالت میں نظر آ رہا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ لوگ میری موجودگی کو نظر انداز کر کے بدستور محوِ گفتگو رہے۔ وہ لوگ کسی لڑکی کی شادی کے متعلق بحث میں مصروف تھے۔ ان کی طرف متوجہ ہو جانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی، مگر مجھ پر ان کی بات چیت کا ردِ عمل یہ ہوا کہ میں اپنے خیالات کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کرنے لگا..... چائے پینے کے کچھ دیر بعد تک میں وہیں جما رہا اور اچانک ہی اٹھا اور اس سنسان سڑک کے سینے پر قدم رکھتا ہوا چلتا رہا جو غالباً اس جگہ پہنچتی تھی جہاں آثارِ قدیمہ واقع تھے۔ مٹی کی سوندھی گندھ نے مجھے اس بات کا احساس دلایا کہ بے موسم کی برسات کب کی تھم چکی تھی۔ اور اب ہوا میں ایک ناقابلِ بیان تازگی رچ گئی تھی۔ میں نے تعریف کرنے والی نظروں سے سڑک کی گیلی مٹی کو دیکھا اور بڑھتا چلا گیا۔ ٹکٹ گھر کی کب کی بند ہو چکی تھی اور مجھے ٹکٹ خریدنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن دروازہ بند دیکھ کر میں نے اس پروگرام کو ہی ملتوی کر دیا۔ وہیں پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ کر ایک سگریٹ سلگانے کے بعد میں نے اس بات پر تعجب محسوس کیا کہ دن بھر میں یہ میری پہلی سگریٹ ہی تھی۔

آخر کار میں وہاں سے بھی اٹھ گیا۔ شاید دو تین گھنٹے تک میں وہاں

بیٹھا رہا تھا۔ کوئی پرانی فلمی دھن تھی جو میرے ہونٹوں پہ بار بار آجاتی تھی۔ یہاں آنے پر میں کتنا بدل گیا تھا۔ کوئی فکر ہی نہیں تھی، کوئی غم ہی نہیں تھا۔ ہر طرف صرف میں تھا۔۔۔۔ ہوٹل پر رک کر میں نے ایک چائے اور پی۔ ہوٹل والے ہی نے بتایا تھا کہ اب صبح تک کوئی بس نہیں جاتی اور نہ ہی ساڑھے تین بجے سے قبل کوئی ٹرین۔ مجھے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ساری رات ہوٹل پر ہی رہتا ہے، مگر گیارہ بجے کے قریب ہوٹل بند کر دیتا ہے۔ بات چیت کے دوران ہی میں اس نے شطرنج میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر کیا تھا۔ بازیاں جمتی رہیں، شب گزرتی رہی۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ اس رات چھ میں سے پانچ بازیاں میں نے ہی جیتی تھیں۔

قریب تین بجے ہم اٹھے۔ ہاتھ ملا کر میں نے اسے شب بخیر کہا اور اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ اس وقت میری جیب میں پتھر بھی تھا اور بلیڈ بھی۔ ایک مختصر انتظار کے بعد ٹرین آکر رکی۔ اس دفعہ میں نے ٹکٹ خریدا تھا۔ مگر اس دفعہ کمپارٹمنٹ میں تنہا نہیں تھا۔ ایک بوڑھی عورت اور اس کی دو جوان لڑکیاں بھی میرے کام میں رکاوٹ بن گئی تھیں۔ اور اس طرح سے پتھر اور بلیڈ کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ شاید اسی لئے میری آنکھیں نیند سے بھاری ہونے لگی تھیں۔ وہ لوگ تاش کھیل رہی تھیں۔ میں نے ان سے اجازت لے کر سگریٹ سلگائی اور دلچسپی سے ان کے کھیل کو دیکھنے لگا۔ انہوں نے مجھے بھی شامل ہونے کو کہا اور میں تو جیسے اسکا منتظر ہی تھا

ٹرین کچھ اسٹیشنوں پر رکی اور چلی..... اور اب میں ان لوگوں کو شب بخیر کہہ رہا تھا۔ مگر اب شب بخیر تھی ہی کہاں، کلائی کی گھڑی میں تاریخ بدل چکی تھی اور ساڑھے پانچ ہو رہے تھے..... ایک تانگے والے کو میں نے گھر کا پتہ دیا اور شہر کے دوبارہ زندہ ہو جانے کے امکانات سے متعلق سوچنے لگا۔ شہر بڑا پیارا لگ رہا تھا..... روشنیاں اونگھ رہی تھیں، تاریکیاں دم توڑ رہی تھیں اور دروازہ کا تالا کھولتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اب گیارہ بجے تک سوتا رہوں گا۔

— آجکل، دہلی

مانک ٹالہ | ایک دن کا سلطان

نرس پہیے والی کرسی پر بٹھا کر اسے لان میں لے آئی تھی۔

اس نے ہلکی سی انگڑائی لی اور اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کی چھوٹی بڑی ٹکڑیاں آوارہ خرامی کر رہی تھیں۔ نرم مدھم ہوا کے جھونکوں سے گلاب کیاریوں میں ہنڈولوں کی طرح جھول رہے تھے۔ انار کی جھاڑیاں سرخ کلیوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔ عشق پیچاں کے نیلے نیلے پھول گراموفون کے بھونپو کی طرح یوں کان کھڑے کیے ہوئے تھے کہ جیسے ابھی ابھی ریکارڈ کے سینے پر سوئی رگڑ کھائے گی اور ان کے اندر سے موسیقی کی لہریں پھوٹ نکلیں گی۔ بہار کی کچی رُت انگڑائیاں لے رہی تھی۔

اتنے میں طوطوں کی ایک ڈار عین اس کے اوپر سے ٹیں ٹیں کرتی پھُر سے گزر گئی۔ اس کی نگاہیں، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے طوطوں کا پیچھا کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور حیران سا ہو کر اپنے چاروں طرف

دیکھنے لگا۔ پچھلے چالیس پینتالیس برس میں اُس نے ایسا دل فریب نظارہ نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا بھی ہو تو اُسے یاد نہیں تھا۔ یا پھر دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا ہوگا کہ اس نے پیسہ کمانے اور اپنے کاروبار کو وسعت دینے میں اپنے آپ کو اس قدر مصروف رکھا تھا کہ اُسے رات، دن کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ کاروبار کی بے پناہ مصروفیتوں کے جھمگھٹ میں زندگی کی کوئی لطیف لہر اس کے دل کو نہیں گدگدا سکی تھی۔ کوئی رنگین جذبہ اس کے من میں ترنگیں پیدا نہ کر سکا تھا۔ چالیس سال کا عرصہ طوطوں کی ڈار کی طرح پھُر سے اڑ کر ماضی کے اُفق کی کوکھ میں غائب ہو چکا تھا اور آج وہ اپنے گرد و پیش کو اس طرح حیران حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ آنکھ کھولی ہو یا رپ وان وِنکل کی طرح ایک طویل خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اس کی حالت اس شیر خوار بچے کی سی ہو رہی تھی جو شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہا ہو اور احساس کے کھل جا سم سم نے پلک جھپکنے میں چالیس چوروں کے عجیب و غریب غار کا سنگین پھاٹک اس کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہو۔

چھ ماہ پہلے اس کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ جو اس قدر شدید تھا کہ ذرا سی غفلت بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ بہترین ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں اور قابل نرسوں کی رات دن کی دیکھ بھال کے نتیجے میں اُسے ایک دوسری زندگی نصیب ہوئی تھی اور کل ہی شام کو وہ ایک طویل عرصہ کے بعد شہر کے بہترین نرسنگ ہوم سے گھر واپس آیا تھا۔

لان کے سامنے بجری کی سرخ روش پر دھوپ سر پر ڈھلے کپڑوں کی

گھڑی لادے کمر لچکاتی ہوئی بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھوبن کی لچکتی کمر کا تعاقب کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ دھوبن پٹاخ سے دروازے کے پٹ کھول کر شڑاپ سے اندر غائب ہو گئی۔ اُس کے من میں ایک میٹھی سی ہوک اٹھی۔

اس کا تصور پینتالیس سال پیچھے کی طرف پلٹا اور اس کے سامنے اس کی رادھیکا کا سڈول جوان سراپا لہرانے لگا۔ جب وہ کمر لچکاتی ہوئی چلتی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ اس کا دل اپنے قدموں تلے مسلتی ہوئی جا رہی ہے۔ رادھیکا کا بھولا بھالا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ اُس کی بوڑھی سرد رگوں میں جوانی کا خون ٹھاٹھیں مارنے لگا اور ان سرد اندھیری راتوں کا جادو بنسری بجانے لگا۔ جب وہ دھڑکتے دلوں سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ایک ایک سیڑھی ٹٹول ٹٹول کر چڑھتے ہوئے کوٹھے پر پہنچ کر ایک دوسرے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اس انتظار میں بھی کیسی میٹھی کسک ہوا کرتی تھی! جیسے کوئی من کو ہولے ہولے روئی کے گالوں کی طرح ملائم انگلیوں سے گدگدا رہا ہو۔ پھر ان کا سرگوشیوں میں باتیں کرنا۔ بالکل بے معنی سی بے ربط سی باتیں۔ لیکن ان بے ربط باتوں میں بھی کس قدر موسیقی ہوتی تھی۔ جیسے اُفق کے اُس پار کوئی چرواہا الغوزے بجا رہا ہو۔ پھر ان کا پہروں بالکل خاموش بیٹھے رہنا۔ اس خاموشی میں بھی کس قدر تکلم پنہاں ہوتا تھا۔ پھر اس کا اندھیرے میں رادھیکا کا گول مٹول چہرہ ٹٹولنا اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں سمیٹ کر اس کی خمار آلود آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دینا۔ رادھیکا کی گرم

مِتھُن

راجندر سنگھ بیدی

بازار ہی لمبا ہو گیا تھا اور یا پھر کاروبار چھوٹا... معلوم ہوتا تھا پچھم کی طرف جہاں سڑک تھوڑا اُٹھتی، آسمان سے لگتی اور آخر ایک دم نیچے گر جاتی ہے وہیں دُنیا کا کنارہ ہے جہاں سے ایک جست کریں گے، اس جینے کے ہاتھوں مر رہیں گے۔

دن بھر سر دھننے کے بعد مگن ٹکلے۔ کباڑیئے کو دو ہی چیزیں ہاتھ لگی تھیں ایک فاؤنٹین اور دوسری جیمنی رائے۔ فلونٹین کو تو شاید کوئی سر پھرا فلم پروڈیوسر کرائے پہ لے بھی جاتا، مگر جیمنی رائے؟ کوئی بات نہیں آج وہ اسے چھپا کر رکھے گا تو کل اس کے پوتے پڑپوتے اس سے کروڑوں کمائیں گے۔ جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے لیونارڈ کے اسکیچ نکل آئیں تو آرٹ کے بازار میں اُن کی بولی لاکھوں تک جاتی ہے۔ ان لاکھوں کروڑوں کے خیال ہی سے مگن لال کی آنکھوں میں بجلیاں کوندنے لگیں اور وہ یہ بھول گیا کہ وہ چالیس بیالیس سال کا اور ٹکلا — گنجا ہونے کے باوجود کنوارہ ہے۔ اس لئے پوتوں پڑپوتوں کی بات ہی نہیں مگن کرتا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا، اتنے بڑے فلسفے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندر کا بنیا پن نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں پیسے کو مایا یا رت آدِ کہہ کر اسے پرے ڈھکیل دیتا ہے، لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگاتا ہے۔ دنیا بھر میں اگر کوئی اس کی پوجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی

گرم سانسوں کی مہک۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ مہکار اس کے نتھنوں کے آس پاس ہی منڈلا رہی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں کہ شاید رادھیکا اس کے قریب بیٹھی اس کے گھنگھریالے بالوں کو سہلا رہی ہوگی۔ لیکن رادھیکا نہیں تھی۔ اس کی سانسوں کی مہک بھی نہیں تھی۔ اس کی خاموش نگاہوں کا تکلم بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا کہ شاید رادھیکا کی انگلیاں اسکے گھنگھریالے بالوں میں پھنسی ہوں گی۔ لیکن اس کا سر چٹیل میدان کی طرح صفا چٹ ہو چکا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کی چندیا پر پھسلتا ہوا اس کی گود میں آ رہا تو اسے احساس ہوا کہ ماہ و سال کی گردش نے اس کا چھریرا کسرتی بدن کھنڈر میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

چالیس سال دھن و دولت بٹورنے میں وہ اس قدر مگن رہا تھا، کہ اسے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اُچٹتی ہوئی بکھری بکھری سی یادیں خواب کے ٹکڑوں کی مانند ذہن کے گوشوں میں، دلدلی تالاب میں موت سے ہمکنار مچھلیوں کی طرح تلملا رہی تھیں۔ ان مٹتی، سانس توڑتی نیم جان یادوں کے علاوہ اس کا ذہن ایک بے آب و گیاہ ریگستان کی طرح بن چکا تھا۔ جہاں سبزے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہ تھا۔ برکھا کی ایک ننھی سی بوند بھی نہیں تھی۔ زندگی کا ہرا بھرا چمن تپتی ہوئی ریت کا صحرا بن چکا تھا۔

اُس نے شادی کی (رادھیکا سے نہیں) بچے پیدا کئے۔ بیوی بھگوان کو پیاری ہوئی۔ بچے بڑے ہوئے۔ ان کی شادیاں ہوئیں۔ ان کے بچے ہوئے۔ لیکن یہ سب واقعات جیسے حقیقت کی دنیا سے دور دور کسی گہری دھند میں

لپٹے ہوئے گم سم سے گزر گئے کہ وہ دولت کمانے میں، سونے کے انبار لگانے میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ اُسے دنیا کے کسی کاروبار سے دلچسپی نہیں رہی تھی اور اگرچہ اب وہ لکھ پتی کہلاتا تھا۔ بڑے بڑے کاروبار، ملیں، عالیشان عمارتیں اس کی ملکیت تھیں۔ بہت بڑے عالیشان بنگلے میں رہتا تھا۔ لیکن اس تگ ودو، اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ تھا کہ آج وہ دل کا مریض تھا۔ زندگی کے لطیف جذبے جوانی کی اُمنگیں، اُمنگوں کی خلش، ولولے، ترنگیں، چاہتیں سب ہوا کے ایک نامعلوم جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزر گئے تھے اور اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اور آج وہ اپنے چاروں طرف اجنبی اجنبی نگاہوں سے تک رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ زندگی اس قدر حسین تھی، دنیا اس قدر رنگین تھی، اس کے چاروں طرف بہار انگڑائیاں توڑتی رہی تھی۔ لیکن اس کی اپنی زندگی میں پت جھڑ اپنا بس گھولتی رہی تھی۔

کچھ لوگ اس لئے بدقسمت کہلاتے ہیں کہ مسرتیں اُن کے مقدر میں نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ اس لئے بدقسمت تھا کہ مسرتیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ لیکن اُسے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

آیا اُس کے منجھلے لڑکے کی سب سے چھوٹی لڑکی کو گود میں اٹھائے باہر پورچ میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ گل گوتھنی سی لڑکی آیا کی گود میں اپنے آپ خوش ہو ہو کر ہاتھ پاؤں مار مار کر ہمک رہی تھی۔ سامنے درخت پر چہکتی ہوئی چڑیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر، چہک چہک کر بلا رہی تھی۔ اور منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال رہی تھی۔

وہ ابھی بیتی ہوئی ویران بہاروں کا سوگ منا رہا تھا۔ لیکن اب اس کے سامنے آنے والی بہاریں شہنائیاں بجا رہی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا اور تلخ یادوں کو، مردہ خوابوں کو کسی گہری قبر میں دفن کر کے دونوں بانہیں پھیلا کر نئی بہاروں کے استقبال کے لئے تیار ہو گیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے آیا کو قریب بلایا اور بچی کو اس کی گود سے لے کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال کر چہرے کے عجیب و غریب زاویے بنا بنا کر اسے ہنسانے لگا۔ پھر اس کے ننھے منے پیٹ پر اپنا منہ رکھ کر ہونٹوں سے پھڑپھڑاہٹ پیدا کر کے اُسے گدگدایا تو وہ خوشی سے چیخیں مارنے لگی۔ ادھ کھلی مٹھیوں کو زور زور سے ہوا میں لہرایا تو اسکی ننھی منی انگلیوں کی جکڑ میں اس کی مونچھیں پھنس گئیں۔ وہ کھینچتی رہی اور یہ اس انداز میں انھیں چھڑانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ انگلیوں کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکیں اور خوش ہو ہو کر پیار بھری ننھی منی سی، بے معنی گالیاں دیتا رہا۔ پھر اس کے ننھے سے سر کو اپنے سینے سے چمٹا کر اس کی پیٹھ پر ممتا بھرا ہاتھ پھیرتا رہا اور اُسے ایک عجیب و غریب الجانی سی مسرت کا احساس ہونے لگا۔ ایک ملکوتی سکون اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگا۔ اس کے منہ میں مٹھاس سی گھلنے لگی جیسے کوئی بوند بوند شہد ٹپکا رہا ہو۔

پھر تھک کر اس نے بچی کو آیا کو دے دیا۔ آیا بچی کو لیکر واپس اندر چلی گئی۔ بچی اس کی گود میں مچلتی، کلکاریاں مارتی رہی۔ زور زور سے ہاتھ ہلاتی رہی۔ وہ بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اس کی طرح حرکتیں کر کر کے خوش ہوتا رہا۔

بچی کے چلے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک خوشی کی لہریں اس کے جسم میں بجلی کی رَو کی طرح دوڑتی رہیں۔ اُس کے چہرے پر مسکانیں مچلتی رہیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنے آپ کو اس قدر شاداں و فرحاں محسوس کرنے لگا تھا جیسے زندگی کی ساری خوشیاں اس کی جھولی میں آ پڑی ہوں۔ ایسی خوشیاں جن کے سامنے اس کی ساری دولت کے انبار بھی ہیچ تھے۔

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور ایک مرتبہ پھر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کا باغ رنگا رنگ پھولوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس کا باغ اس قدر خوب صورت تھا، آج تک اسے اس کا کبھی احساس نہیں تھا، آم کی کونپلوں گلاب کے پھولوں اور انار کی کلیوں کی مہک فضاؤں میں مہک رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا جیسے ساری مہک اپنے پھیپھڑوں میں بھر لے گا۔ ہر طرف ہریالی، مہک اور رنگوں کا راج تھا۔ ہواؤں سے جیسے موسیقی سی پھوٹ رہی تھی۔ فضا جیسے غسل کے بعد نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ اس نے حیران ہو کر ایک مرتبہ پھر آنکھیں جھپ جھپائیں۔ چاروں طرف رنگوں، خوشبوؤں اور مسرتوں کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ آج اتنی ساری مسرتیں کہاں سے دبے پاؤں چلی آئی تھیں۔

لنچ کے بعد اس نے دو تین گھنٹے بھرپور آرام کیا اور جب وہ پوری طرح تازہ دم ہو گیا تو نرس اس کے کہنے پر اسے کرسی پر بٹھا کر برآمدے میں لے آئی، سہ پہر کے قریب بچے اسکول سے آ گئے۔ کار پورچ میں رکی اور بڑے چھوٹے سب بچے شور و غل مچاتے ہوئے کار سے اترنے لگے۔ وہ برآمدے

میں بیٹھا سب منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ سے اندازہ کرلیا کہ آٹھ دس بچے تھے۔ ان میں سے کئی کے وہ نام بھی نہیں جانتا تھا اور کچھ بچوں کو اگر وہ گھر سے باہر دیکھتا تو شاید انھیں پہچان بھی نہ پاتا۔ اس نے ساری زندگی میں چند لمحے بھی بچوں کے ساتھ نہیں گزارے تھے۔ بہرحال اس کا سینہ فخر سے پھول گیا کہ وہ دس بارہ بچوں کا دادا ہے اور اس کے من میں بچوں کے لئے ممتا کا جذبہ لہریں مارنے لگا۔

جب بچے برآمدے کے قریب پہنچے اور دادا جی کو برآمدے میں موجود پایا، تو بڑے بچوں نے مڑ کر منہ سے ششی ششی کی آواز نکالتے ہوئے اور منہ پر انگلی دکھ کر باقیوں کو چپ کرانے کے انداز میں سرگوشیوں میں کہا "چپ کرو، دادا جی بیٹھے ہیں ـــــ" سارے بچے سہم گئے اور باادب باملاحظہ ہوشیار کے انداز میں فرش پر نظریں گاڑے گزرنے لگے۔

"ارے بھئی! میں تمہارا دادا ہوں کوئی بھوت نہیں ہوں، ادھر آؤ سب میرے پاس اور خوب شور وغل مچاؤ، آج تمہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ آؤ میرے پاس، آج سے تم سب آزاد پنچھی ہو" اس نے دونوں باہیں وا کرتے ہوئے چہرے پر مسکانیں بکھیرتے ہوئے کہا۔

بچے چند لمحے اس طرح ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے جیسے انھیں اپنے کانوں پہ اعتبار ہی نہ آ رہا ہو۔ لیکن جب دادا جی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تو ان کے سب خدشے دور ہو گئے۔ بچوں کے من میں میل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ محبت بھری نگاہوں میں دوستی کے جذبات کو پڑھنے میں دیر نہیں کرتے۔

سبھی بچے اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ان سے محبت بھری باتیں کرتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے گالوں کو پیار سے کھینچ کر ان پر پیار نت کرتا رہا۔ ان سے توتلی زبان میں باتیں کرتا رہا۔ کتے بلی کی آوازیں نکال کر انھیں ہنساتا رہا اور سب بچے اس سے یوں گھل مل گئے جیسے برسوں سے دادا جان اُن کے ساتھ اسی طرح پیش آتے رہے ہوں۔ وہ برسوں کا یہ دستور بھی بھول گئے تھے کہ دادا جان کی موجودگی میں کوئی بچہ اونچی سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ دادا جان کی گھر میں موجودگی کے دوران بچے سہمے سہمے سے اپنے کمروں میں چھپے چھپے سے پھرتے تھے۔ گھر بھر میں موت کا سا سکوت چھایا رہتا تھا۔ لیکن اس کے ایک ہی قدم سے گھر کی سا ونت وادی فضا بدل گئی تھی سب بچوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ اس نے بچوں کو بتایا کہ رات کے کھانے کے بعد سب بچوں کو چاکلیٹ اور ٹافیاں ملیں گی۔ بچے خوشی سے تالیاں بجاتے اپنے اپنے کمروں کی طرف بھاگ گئے۔

رات کے کھانے کے بعد سب بچے اس کے کمرے میں اکٹھے ہوئے۔ اُن کے والدین بھی تھے۔ سب کے چہروں پر خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ ایسا غیر رسمی اجتماع سب کی زندگی میں پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ بچے چہک رہے تھے۔ بڑے بھی خوش تھے کہ ایسی خوشگوار فضا میں وہ پہلی مرتبہ سانس لے رہے تھے دادا جی نے چاکلیٹ اور ٹافیاں منگوا رکھی تھیں۔ انھوں نے بچوں میں ٹافیاں اور چاکلیٹ تقسیم کئے۔ سب بچے خوشی خوشی اپنی ٹافیاں کھانے لگے۔

"دادا جی بے بی کو بھی ٹافی دو۔" ننھے رمیش نے اپنی شیر خوار بہن کی

سفارش کی۔

"بے بی کے ابھی دانت نہیں نکلے بیٹے۔ وہ کیسے کھائے گی"۔ اس کی ممی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بے بی کے دانت کب نکلیں گے ممی"۔

"وہ جب بڑی ہو گی تب اس کے بھی دانت نکلیں گے اور وہ بھی ٹافیاں کھائے گی"۔ ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ممی دادا جی اتنے بڑے ہو گئے ہیں ان کے دانت کیوں نہیں نکلے"۔ معصوم رمیش نے بڑے بھولے پن سے دادا جان کے پوپلے منہ کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔

رمیش کی بھولی بھالی بات سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ وہ ہنستا رہا خوب زور سے۔

ہنستے ہنستے ہی اچانک اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔

—— تحریک، دہلی

احمد یوسف | سایۂ رمِ آہو

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں..... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں..... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں۔

بڑا ہی دھندلا دھندلا سا غیر واضح سا نقش ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ چچا میاں ہیں، دلی میں رہتے ہیں۔ فراخ سینہ، کشادہ پیشانی، سیاہ سرج کی شیروانی، چست پائجامہ ـــــ جانے کون سی خوشبو تھی، جسے میں نے ان میں لپٹ کر بڑی عافیت سی محسوس کی۔

"ارے دادی اماں یہ تو بالکل خوشبو ابا ہیں، خوشبو ابا ـــــ"

اور چچا میاں نے جیب سے ٹافیوں کا ڈبہ نکالتے ہوئے کہا "بچی سن لیا آپ نے میرا نیا نام" ـــــ

"خوشبو ابا آپ کب تک جائیں گے"؟

کسی نے ایک چپت رسید کی ـــــ "مدت کے بعد تو آئے ہیں اور یہ ابھی سے جانے کی باتیں کر رہا ہے"۔

"خوشبو ابا دلی کہاں ہے؟"

خوشبو ابا ہم سبھوں کو اکٹھا کر لیتے — "دلی پچھم میں ایک بڑا شہر ہے، وہ ہمارے ملک کا دارالسلطنت ہے"۔

اور کوئی پوچھ بیٹھتا — "دارل سُل طَنت کیا چیز ہوتی ہے"۔

"دارالسلطنت میں والسرائے یعنی بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ سارے ملک کا انتظام وہیں سے ہوتا ہے"۔

اور جب ہم جامع مسجد، لال قلعہ، قطب صاحب کی لاٹ اور ہمایوں کے مقبرے کی سیر سے واپس آجاتے تو خوشبو ابا کہتے اچھا تو پھر کبھی اور — رات کے وقت وہ پھر پکڑے جاتے — "آج میں تم لوگوں کو حضرت یوسفؑ کا قصہ سناؤں گا"۔

"تو حضرت یوسف نے ایک رات خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے، چاند اور سورج انہیں سجدہ کر رہے ہیں ....."

اور جب کبھی چاند تارے اونگھنے لگتے تو چچا میاں اٹھتے ہوئے کہتے۔

"اچھا بھائی تو باقی کل"—

اور میں ان کی گردن میں جھول جاتا — "چچا میاں کہانی ختم کر کے جانا ہو گا یہ بات درست نہیں ہے"۔

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں .... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں .... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں۔

اس دن بڑے دادا میاں خوشبو ابا کو کچھ سمجھا رہے تھے —

"ایک چھوٹا سا خوبصورت سا گھر .... اس گھر کی ایک بہو ...."

"گھر میں ہنستے کھیلتے بچے ......" جیسے پھوپھی نے انہیں لقمہ دیا۔
"یہی تو زمانے کا دستور ہے بیٹے۔"
آخر چچا میاں زیرِ دام آہی گئے۔ فضائے بسیط میں رہنے والوں کو بالآخر آشیانے کی طرف لوٹنا ہی پڑتا ہے۔
بڑے دادا میاں نے گویا خوشبوؤں کو مقید کر لیا تھا۔
اور ہم میں سے کسی نے چہرے پر بزرگانہ سنجیدگی لاکر کہا۔
چچا میاں ایک چھوٹا سا خوبصورت سا گھر ہوتا ہے۔ اس میں ایک بہو ہوتی ہے۔ اس میں ایک آنگن ہوتا ہے، ایک دالان ہوتا ہے، دالان میں چکی ہوتی ہے ......"
"اور بیٹے بہو کے جسم پر صاف ستھری ساری ہوتی ہے — چکی میں دانہ ہوتا ہے ......"
"اُف چچا میاں اتنے زور سے کان نہ کھینچئے۔"
اور چچا میاں نے قہقہوں کے درمیان چلّا کر کہا — "کھابی یہ بچے تو مرتضیٰ حسین کے بھی کان کاٹتے ہیں۔"
"اللہ توبہ ہے۔ بھتیجوں کو کھانڈ ہی بنا کر دم لیا۔"
سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں .... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں ......"
ہم نے کئی سرحدیں، کئی چوکیاں پار کر لیں — لیکن یہ کیا چچا میاں تو پابہ زنجیر نظر آ رہے تھے — "خوشبو ابا آپ؟"

کے روز پرانت کے نیچے اجیوتی کے ساتھ، دودھ پانی میں نہایا، سندور میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دسہرے کے دن اس کی گاڑی پہ صد برگ کے ہار ہوں گے اور سب نرناری مل کر لکشمی کے مندر کو جائیں گے ..... پوجا کے لئے پیسے کے لئے تو وہ یوسف سابر اور پدمنی ایسی تتلی کو بھی بیچنے کیلئے تیار ہو جائے۔

اور سامنے تھا سراجا کا دکان۔ ایوز بیٹری کا ایجنٹ۔ اس کو تھوڑا پیپل کے گھیر کے پیچھے چھپا ہوئی تھی۔ لجلجے ہندو جب یہ صبح کے وقت آکر پانی میں ملے دودھ کے لوٹے ڈال جاتے تھے اور دوکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کیچ سے اَٹ جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے سراجو کو لجلجے ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ نہیں کرتے تھے، جس کے بارے میں بھگوان نے کہا تھا ___ اور ورکشوں میں میں پیپل ہوں۔ ضرور وہ پچھلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو سینتالیس کے فسادوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

سراجا ہمیشہ پیپل کی گولریں کھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ بازار کا مندہ ہونا یا بھوک نہ تھی۔ سراجا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جو اس کی منی کو منعقد کرے۔ ہاں، مسلمان لِنگ کُٹوں کا یہی ہے نا ___ کھانا، پینا اور بھوگ کرنا۔ وہ دماغی طور پر کوئی ہو بو، کوئی خانہ بدوش ہیں جو ہندوستان میں رہیں تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پاکستان میں ہوں گے تو ___ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔ انھیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں گن ڈھکلے نے کئی بار اس بارے میں سوچا بھی ___ ان کا اللہ، خوب عیش کرتا ہے۔ ایک اپنا بھگوان ہے ___ جو نیچے کے بجائے اوپر تر کُٹی کے آس پاس ہی منزل ہوتا رہتا ہے شاید سراجا جانے بوجھے بنا ایک تانترک تھا جو جو ہندو دکھشا کے لئے کنڈلنی کو جگاتے

"ننھے سنتے ہیں بچوں کی نظر نہیں لگتی۔ لیکن مجھے تو جیسے تم لوگوں کی نظر کھا گئی"۔

"ایک چھوٹا سا گھر ہوتا ہے۔ اس میں ایک بہو ہوتی ہے۔ آنگن میں ہنستے کھیلتے بچے ہوتے ہیں"۔

"روتے بلکتے کہو ننھے۔ روتے بلکتے"۔

"میں دلی میں کیا بُرا تھا۔ یہاں بلا کر گھر کا آنگن..... اور آنگن کی خوشیاں..... یہ خوشیاں انہیں مبارک ہوں جنہوں نے ساری زندگی غموں کے سائے میں کاٹ دی ہو"۔

"لیکن چچا میاں یہ تیشہ ہے۔ کوہکن ہے۔ جوئے شیر ہے"۔

"ننھے ان لوگوں نے تو میری راہوں میں سنگِ گراں ڈال دیئے۔ میں یہاں کیا کر سکتا ہوں"۔

"دکان بغیر مال کے نہیں چمکتی۔ نوکریاں سندھی مانگتی ہیں"۔

چائے تہ جام تک آ پہنچی تھی۔ چچا میاں نے جیب سے بیڑیوں کا ڈبہ نکالا۔

خوشبو! آپ کے پاس تو بڑا خوبصورت مراد آبادی سگریٹ کیس رہا کرتا تھا"۔

لیکن چھوڑو اب کیا پوچھا جائے اور کن کن چیزوں کو پوچھا جائے۔ انہوں نے چونک کر ہانک لگائی۔ "بھئی ایک پیالی چائے اور بھیج دو"۔

"خوشبوا با جائے اور تلخیوں میں کیا رشتہ ہے؟"

"بچے بڑے ہو گئے چچا میاں"

"ارے ننھے یہ کمبخت کیا پڑھیں گے، انہیں دھینگا مشتی سے کب فرصت ہے۔ سنجھلے کو پڑھاتے وقت میں نے ایک دن ذرا ایک تھپڑ لگا دیا کئی دنوں تک اس کا گال سوجا رہا۔ پڑھائی ان کی قسمت میں نہیں ہے"

چچا میاں بڑی خوش اسلوبی سے اصل وجہ چھپا گئے۔

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں.... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں....

"کام کیا ہے، بس دفتر میں جو خطوط آتے ہیں انہیں چیئرمین یعنے بھائی جان کے پتے پر بھیج دیتا ہوں"

"لیکن کلکتہ جیسا دیسع دعریض شہر اور پچاس روپلیاں"

"میں نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی"

"دمے کہ می گزرد"

"دیکھو یہاں پر 'تیر' مناسب ہوگا یا 'تر'"

"اتنی محنتوں کے بعد تو زندگی کا معمہ بھی حل ہو جاتا"

"ننھے تو تو بڑا فلسفی ہوتا جا رہا ہے"

"خوشبوا با فلسفے نے بھی تو اسی دنیا میں جنم لیا ہے"

"میں تو بھیا یوں ہی کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچا ہوں"

خوشبو ابا اس بار بھی اپنے دست و بازو کی سرد مہری کا تذکرہ کئے بغیر آگے بڑھ گئے ـــــ

" تو پھر یہیں آجاؤ ..... "

دو بڑی میزیں، ایک الماری، دو ایک کرسیاں، فائلوں کا انبار ـــــ

" ان میں سے ایک میرے حصے میں آئے گی ۔ یا خدا میز بھی کوئی سونے کی چیز ہے "۔

" مہینے میں بیس روپے کھانے کے ۔ دس روپے میں دھوبی اور دیگر اخراجات ۔ پورے بیس روپے گھر بھیجتا ہوں " ـــــ

" ماجد ابھی سینما میں ہے، اسسٹنٹ منیجر ہو گیا ہے شاید ۔ ارے ننھے میاں میں تو اس کی ایک پائی بھی نہیں جانتا ۔ دیکھو ساجد کیسا نکلتا ہے ۔ خبر ملی کہ آٹو موبائیل کی ٹریننگ لے رہا ہے ۔ ہاں اکثر گھر والے یاد کر لیتے ہیں " ـــــ

" سید صاحب یہ پڑھئے ۔ رضوان سیریز کی نئی ناول " رائفل کا گیت " ۔

" بڑی اچھی خبر دی صاحب " ـــــ

اکبنی لائبریری میں جاسوسی اور رومانی ناولوں کا انبار لگا تھا ۔

" ننھے تم پڑھتے ہو رضوان سیریز کی ناولیں ؟ " ـــــ

" ان کے لئے چچا میاں بہت سے تجربوں سے گزرنا پڑیگا " ـــــ

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں ..... سب ایک ہی سمت

جا رہے ہیں ـــــ

بھئی جب دفتر ہی اٹھ گیا تو پھر کلکتے میں رہ کر کیا کرتے ـــ

"کلکتہ روشنی اور آبادی کا شہر ـــ کل کارخانوں کا شہر"۔

"اب میں کس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ـــ ساجد آٹو موبائل کی ٹریننگ ختم کر چکا ہے، زاہد بھی کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔ اللہ مالک ہے"۔

ادھر میں نے ایک ملفوظات "تذکرۂ غوثیہ" ختم کی ـــ عشا کے بعد چچا میاں نے تذکرۂ غوثیہ کا ذکر چھیڑ دیا ـــــ

وہی چچا میاں تھے، وہی ان کے قصے تھے، لیکن بیس پچیس سال جیسے بلا کہے سنے ہمارے درمیان سے دبے پاؤں نکل بھاگے تھے۔

"ننھے میں نے بیوی بند کی ایک نظم" شکوۂ ہند" کہی تھی (سرگوشی کے انداز میں) گھر والوں نے میری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیا"۔

"وہ کیسے چچا میاں؟"

تجاہلِ عارفانہ ـــــ

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں..... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں.....

"اکثر کھانستے کھانستے خون بھی آجاتا ہے"۔ انہوں نے گلے کی گلٹی دکھاتے ہوئے کہا ـــــ

"چچا میاں کسی کو دکھایا آپ نے" ـــ میں نے تشویش کا اظہار کیا ـــــ

"کئی ڈاکٹروں کو" — انہوں نے کئی ایک ڈاکٹروں کے نسخے دکھائے۔
"یہ بلاک کا ڈاکٹر ہے۔ یہ ہسپتال کا ڈاکٹر ہے"۔
"تو چچا میاں گویا کہ......"

جی چاہا کہ خوشبو ابا سے پھر ایک بار لپٹ جائیں — "یہ کیا مذاق ہے۔ خوشبو ابا ابھی تو محفل رنگ پر آئی ہے"۔

"ارے ننھے — بڑھتے جاتے ہیں دکھ یہ عمر جوں جوں گھٹتی جاتی ہے
مگر میں سوچ کر خوش ہوں کہ بڑی کٹتی جاتی ہے"

"لیکن چچا میاں ہم تو کسی اچھے ڈاکٹر سے معائنہ کرائیں گے"۔

"مرض کئی موسم دیکھ چکا ہے جناب۔ لیکن شعاعیں آرام پہنچائیں گی ان سے کہئے کہ اسے جاری رکھیں"۔ ڈاکٹر نے کنارے سے لے جا کر بتایا —

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں.... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں....

"چچا میاں خبر ملی کہ آپ نے ہسپتال کا علاج بند کر دیا ہے"۔

"ایلوپیتھک علاج پر سے تو جیسے میرا عقیدہ ہی اکھڑ گیا۔ یہ دیکھو یہ ہومیوپیتھک کی ایک بڑی عمدہ دوا ہے"۔

"چچا میاں یہ عقیدے کی بات کہتے وقت آپ نے پھر اصل وجہ کو بڑی خوبصورتی سے چھپا لیا"۔

"پیسے کی واقعی بربادی ہے ننھے"۔ آج تو ان کی ہنسی بھی ماتم کناں تھی۔

ایک اتھاہ سناٹا! ——

"لیکن یہ کیا —— ارے یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے ننھے میرے بچے"۔

"مجھ پر جو ظلم ہوئے ہیں ان کے مقابلے میں تو یہ مرض ہیچ نظر آتا ہے"۔

پھر وہی ہنسی ——

"اچھا بتاؤ دنیا کا کیا حال ہے؟"۔

"دل کا انقلاب ہی کیا کم ہے"۔

"ننھے میں انہیں واپس نہیں کروں گا اور اب ان کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے"۔

"چچا میاں خدا کے لئے ......"

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں ..... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں ......

"چچا میاں آپ نے یہ کیا خاموشی پھیلا رکھی ہے۔ کچھ نہ سہی تو تذکرۂ غوثیہ ہی سہی"۔

خاموش نظروں نے کلام کیا، ہاتھوں نے مدعا بیان کیا۔

"اشاروں سے نماز پڑھتے ہیں۔ گھٹی گھٹی آواز سے کبھی کچھ بول بھی لیتے ہیں"۔

"ننھے سب کے پتے لکھ دو، میرے قصور معاف کرا لینا۔ خوش رہو"۔

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں..... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں.....

"یہ کیا چچا میاں فجر کا وقت جا رہا ہے اور آپ پڑے الٹی سیدھی سانسیں لے رہے ہیں"۔

"کہانی ختم کر کے جانا ہوگا یہ بات درست نہیں"۔

یٰسین شریف کی تلاوت ہو رہی ہے۔ چچا میاں آرام سے تکیہ باندھے سن رہے ہیں۔

سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں..... سب ایک ہی سمت جا رہے ہیں ——

"چچا میاں یہاں کتنا اندھیرا ہے"۔

"یہ آج آپ نے کون سی خوشبو لگا رکھی ہے"۔

"ہاں چچا میاں یہاں 'تیرا موزوں رہے گا یا' تبر"۔

"لیکن چچا میاں یہ حل تو درست نہیں"۔

"ننھے میاں ہر شخص سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے"۔

"تو پھر مبارک ہو —— خدا حافظ"۔

"خدا حافظ"۔

قدموں کی چاپ —— قدموں کی چاپ ——

—— مریخ، پٹنہ

سلوٹیں

س۔ش۔ مشہدی

لوگ کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے مگر میں تو کہتی ہوں جوانی بلائے جان ہوتی ہے۔ ہائے بچپن کے وہ دن کیسے مزے کے تھے، گھنٹہ دو گھنٹہ سبق یاد کیا، مولوی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سنی اور پھر مزے کے مزے۔ ابھی نمکولی کی ہنڈیا پک رہی ہے تو ابھی آم کے درختوں پہ جھولے ڈال کر پینگ پر پینگ دی جا رہی ہے۔

آم کے دن آتے تو گویا عید ہو جاتی۔ اُدھر دوپہر میں گھر کے لوگ گرمی کی تپش سے بچنے کے لئے کمروں میں بند ہوتے اور ادھر ہم دبے پاؤں باغ میں..... مالی لاکھ منع کرتا کہ بیٹا لو چل رہی ہے واپس جاؤ نہیں تو بڑے سرکار سے کہہ دوں گا۔ مگر سارے بچے اسے کا کا، کا کا کہہ کر منا لیتے اور پھر تو وہ دھما چوکڑی مچتی کہ الٰہی توبہ۔ راشد اور خلو درخت پر چڑھ جاتے اور ہم نیچے آم چننے لگتے۔ کچے آم کی ٹکوریاں نمک کے ساتھ انسی کھٹی کھٹی اچھی لگتیں کہ دوسرے دن حکیم صاحب کی تلخ دوا پیتے وقت سارا مزا کرکرا ہو جاتا ڈانٹ الگ پڑتی کہ کچے آم کھاتی ہو تو نتیجہ بھگتو۔ اُدھر

بجّو الگ خوشامدیں کرتی کہ "اچھی رفّو، ذری دو ٹکوری مجھے بھی لادو" اور میں اتراجاتی کہ "بڑی دھوپ ہے بجّو" پھر گڑیا کے جہیز سی دینے کے وعدے پہ چھپ چھپا کر بجّو کے لئے دو چار ٹکوریاں لادیتی، جنہیں وہ چھپ کر کمرے میں کھاتیں۔ ایک دن امّی نے انہیں ٹکوریاں کھاتے دیکھ لیا، پھر کیا تھا بجّو کی شامت ہی تو آگئی تھی۔

"جوان ہوگئیں مگر بچپن نہ گیا۔ کچر کچر کچے آم کھاتے وقت کبھی تم نے سوچا کہ تمہیں کتنا نقصان کرے گا۔ عورتوں کو کھٹا نہیں کھانا چاہئے بیٹا۔" اور بجّو مارے شرم کے آنچل میں منہ چھپا لیتیں۔ میں سوچتی آخر عورتوں کو کھٹا کیوں نہیں کھانا چاہئے امی سے پوچھتی تو وہ ڈانٹ دیتیں۔

خلّو چھوٹی خالہ بی کا لڑکا تھا اور راشد میرا سگا بھائی۔ دونوں ہی مجھ سے بڑے تھے مگر جب بھی راشد اور خلّو میں جھگڑا ہوتا میں خلّو کا ساتھ دیتی اور راشد جھنجھلا کر کہتا۔ "رفّو آج سے تو میری بہن نہیں" میں کہتی "میری بلا سے" مگر میں ہمیشہ خلّو ہی کی طرفداری کرتی۔ خلّو مجھے مانتا بھی تو تھا..... آج وہ ڈاکٹر خالد بن کر اتراتے ہیں اور کپڑوں پر شکن نہیں آنے دیتے۔ ورنہ کل ہی کی تو بات ہے، نہ جانے کتنی بار میں نے انہیں زمین میں گرا کر ان کی قمیض میں دھول بھر دی ہے..... مگر وہ بھی تو مجھے کم نہیں ستایا کرتے تھے..... اللہ میری چوٹی کے تو وہ دشمن تھے۔ ..... کوئی بات ہوئی اور انہوں نے میری چٹیا کھینچی..... الٰہی توبہ! میری تو جان ہی نکل جایا کرتی تھی..... جی میں آتا کہ اس

کم بخت چوٹی کو کاٹ کر ہی پھینک دوں۔ مگر بال گوندھتے وقت جب امی پیار سے میرے گھونگھریالے بالوں میں گنگنا کرتے ہوئے کہتیں "میری ارتو کے بال کتنے خوبصورت ہیں" تو مارے فخر کے میرا سینہ پھول جاتا۔ زرد گالوں پر سرخی کی لہر دوڑ جاتی۔ جیسے یہ خوبصورت بال خود میرے ہی اُگائے ہوئے ہوں......

مگر ہائے رے بچپن...... ابھی جوانی آنے بھی نہ پائی تھی کہ بچپن کی آزادیاں قید و بند میں محصور ہو گئیں۔

میرے خدا آخر جوانی آ رہی تھی تو میرا کیا قصور..... اگر میں کنواری تھی تو مجھ پر الزام کیوں...... وہ تو خدا بھلا کرے نانی کا کہ ڈیڑھ دن کی بیماری میں اللہ کو پیاری ہو گئیں ورنہ وہ اور دادی جان مل کر مجھ اکیلی جان کا جینا ہی دو بھر کر دیتیں.....

اگر آنچل سر سے ڈھلک جائے تو میں کیا کروں..... آخر سلک کے دوپٹے ہی تو ہیں بالوں پر کیوں کر ٹھہریں۔ اب کام کرتے وقت اگر دوپٹے کو گردن میں لپیٹ لوں یا جلدی میں دوپٹہ کمرے میں ہی چھوٹ جائے تو کون سی آفت آ جاتی؟ مگر دادی کی آنکھوں میں خون اتر جاتا اور نصیحتیں شروع ہو جاتیں۔

"بہو بیگم سنبھالو اپنی کنواریوں کو، شیطان کے کان دور کہیں خاندان کا نام نہ روشن کر دیں۔" اور امی کھسیا کر رہ جاتیں۔ میں سوچتی یہ جوانی نہ جانے کس گناہ کی سزا میں آ رہی ہے۔ ذرا زور سے چلو تو الگ امی کی

اور اوپر کا راستہ بناتے تھے۔ وہ عورت کے اندر ہی کیڑے پڑے رہتے ہیں۔ لیکن کسی طرح اپنے جوہرِ حیات کو نہ جانے دیتے۔ نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی سوچا کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ اسے بھوکا، پیاسا، روتا، تڑپتا رکھ کر کیسے موکش کو پہونچ سکتا ہے کوئی؟ کس پرماتما کو پا سکتا ہے؟ پھر جو نجات بندو سے چھٹکارہ پا لینے میں ہے ––– پرش کے لئے، استری کے لئے؟ سواتی بوند تو موتی نہیں۔ نہ سیپی موتی ہے۔ موتی تو بوند کے گرنے اور سیپی کے اسے اندر لے کر منہ بند کر لینے میں ہے۔۔۔

رات لپک آئی تھی۔ باہر وہ دنیا کا کنارہ اندھیرے کے ساتھ کچھ اور بھی پاس رینگ آیا تھا۔ ریشم والے ولائتی رام، کشمیری ٹبد شاہ، حتیٰ کہ اُڈپی کے حکیم پانی کی دوکان بھی بند ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے مہینے کا دوسرا اتوار ہونے کی وجہ سے اس کے سب دلی دوسے، سانبر وا کیسری بک گئے ہوں۔ صرف سراج کی دوکان کھلی تھی، نہ جانے وہ کس بار پہ تھا؟ شاید اس لئے کہ بڑی کی ضرورت رات ہی کو پڑتی ہے۔ مگر وہ صبح، صبحِ کاذب ہی کو دکان کھول لیتا تھا، جو رات ہی کا حصہ ہوتی ہے، اس کا آخری حصہ ورنہ صبح کہاں کسی کی رہی، وہ تو کمیونسٹوں کی ہولی۔ شاید سراج ٹورسٹ ایجنٹ نائیکل کے انتظار میں تھا کہ وہ دونوں مل کر اگلے روز کہیں آگرے کھجراہو کا پروگرام بنا لیں تھوڑے پیسے کما لیں۔ نہیں سراج پیسے کے پیچھے تھوڑے جاتا، وہ تو جاتا تھا اُن پچھمی عورتوں کے پیچھے جو کثرالازدواجی کی وجہ سے بھوکی پیاسی آتی تھیں اور یہاں آکر ممتاز کی محبت کو ادھر کے کسی بھی شاہجہاں طبیعت والے درد پر آزماتیں اور کھجراہو کے پتھر کو زندہ کرتی تھیں۔

ڈانٹ پڑتی۔۔۔۔

"۔۔۔۔ ہے ہے رفعت کیسے دھمک دھمک کر چل رہی ہو۔ زمین بد دعا دے گی۔ بیٹا کنواریوں کے یہ چلن نہیں ہوتے"۔۔۔۔

ارے خاک میں جائیں کنواریاں اور نوح یہ جوانی میری تو جان ضیق میں ہے۔۔۔۔ اُدھر میں خود ہی موئی جوانی کے ہاتھوں بیزار۔۔۔۔ نہ جانے دل میں کیسے کیسے خیال آتے۔۔۔۔ میں اپنے جسم کی تبدیلیوں پر غور کرتی تو مارے شرم کے گردن جھک جاتی اور پپوٹے بھاری ہونے لگتے۔۔۔۔ طبیعت تھی کہ ہر وقت مضمحل رہتی۔۔۔۔ نہ کسی کام میں جی لگتا اور نہ کسی سے باتیں کرنے میں۔ اللہ اللہ کر کے نیند بھی آتی تو توبہ کیسے کیسے خواب آتے۔ جن کے بارے میں سوچ سوچ کر میں مارے شرم کے گڑ جاتی۔۔۔۔ اور یہ خالد نہ جانے کہاں سے بھٹکتے ہوئے میرے خوابوں میں چلے آتے۔۔۔۔ وہ تو ڈاکٹری پڑھنے شہر چلے گئے تھے اور برسوں سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی مگر میں ایسی دیوانی کہ خوابوں میں ان سے طرح طرح کی نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی۔۔۔۔ اُف مجھے یاد بھی تو نہیں رہتا تھا کہ خوابوں کی تفصیل دہراؤں۔۔۔۔

وہ تو خدا بھلا کرے نجو کا دہی میری غمگسار تھیں۔۔۔۔ مجھے اداس یا پریشان دیکھتیں تو گلے سے لگا کر اتنا پیار کرتیں، اتنی تسلیاں دیتیں کہ مجھے سکون آجاتا۔۔۔۔ اکثر رات میں ہم دونوں ساتھ ہی پلنگ پر سوتے تھے۔

بجّو کی عمر پچیس سے زائد ہو چکی تھی..... ناک نقشہ کھڑا، بدن گداز اور رنگ تیکھا تھا، مگر بُرا ہو اس گھڑی کا جب دس سال پہلے چیچک نے بجّو کے چاند جیسے چہرے کو گھن لگا دیا..... آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ چڑھ گیا اور نرم و نازک جلد گہرے داغوں سے ایسی داغ دار ہوئی کہ بجّو کی شکل ایک حد تک بھیانک ہو گئی..... یہی وجہ تھی کہ سینکڑوں رشتے آئے، امی اور ابّو نے لاکھ کوشش کی مگر بجّو کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔ درگاہوں کی خاک چھانی گئی، مسجدوں کے طاق بھرے گئے۔ تعویذوں اور گنڈوں کی قطار لگ گئی، مگر بجّو کے سہرے کے پھول نہ کھل سکے اور بجّو دن بدن مرجھاتی رہیں۔

بجّو کی پہاڑ جیسی جوانی دیکھ کر امّی اور ابّو کی آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی اور بجّو کی بے خواب آنکھیں نہ جانے خلاء کی پنہائیوں میں کسے تلاش کرتی رہتیں۔ اکثر رات کی تنہائیوں میں وہ مجھ سے لپٹ جاتیں، ان کی چھاتی زوروں سے دھڑکتی ہوتی اور وہ مجھ سے کہتیں "رفو، تو کاجل کا ٹیکہ لگالے کہیں میری نظر نہ لگ جائے..... تو کتنی خوبصورت ہے رفو..... تیرا دلہا کتنا خوبصورت ہوگا..... اور یہ کہتے وقت بجّو کی آواز بھرا جاتی، ان کا سارا درد ان کی آنکھوں میں کھنچ آتا اور ان کی سانس اتنی تیزی سے چلنے لگتی کہ میں گھبرا جاتی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ گزر جاتا ہے مگر نہیں وقت کب گزرتا ہے..... یہ تو ہماری زندگی ہے جو گزر جاتی ہے

صبح جب بھی آتی تھی اور آنگن میں کھڑے نیم کی پتیوں کو نقرئی لباس دے جاتی تھی۔ شام اور رات بھی تو ویسے ہی آتے تھے..... مگر بجّو کی جوانی ڈھلتی جا رہی تھی۔ امّی اور ابّو کے چہرے پر فکر کی جھریاں آ گئی تھیں۔ امّی کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ ابّو کی کمر بجّو کی جوانی کا بوجھ نہ برداشت کر سکی تھی اور اب خمیدہ ہوتی جا رہی تھی..... بجّو کی آنکھوں پر چڑھے شیشے اور بھی موٹے ہو گئے تھے۔ کان کے پاس کی لٹوں میں چاندی جھلکنے لگی تھی..... دولہا کا انتقال ہو گیا تھا اور گھر پہ موت کا سناٹا طاری تھا..... اب نہ کوئی میرے آنچل کا خیال کرتا تھا اور نہ کوئی ڈانٹنے والا تھا..... مجھے دولہا کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی..... سارا گھر ایک عجیب سے سناٹے کا شکار ہو گیا تھا۔

امی بجّو کی شادی کا انتظار نہ کر سکیں اور خالد کی ضد اور بے صبری اپنا کام کر گئی..... اللہ مجھے یاد ہیں وہ دن جب گھر میں میری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں..... کتنا خوش تھیں بجّو، مجھے کتنا پیار کرتی تھیں وہ..... مگر بجّو کا درد مجھے معلوم تھا..... بجّو نے اپنی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے خشک کر لیا تھا..... میں نے کبھی ان کی آنکھوں سے آنسو گرتے نہیں دیکھے تھے..... مہندی لگی، شہنائیاں بجیں اور میں خالد کو پا کر گویا اسی دنیا میں جنت پا گئی..... مگر بجّو کی زندگی جہنم کی آگ میں جلتی رہی.....

شادی کے فوراً بعد جب میں سہاگ کی خوشبوؤں میں بسی میکے واپس آئی تو بجّو مجھ سے لپٹ کر خوب روئیں تھیں اور ایک مدت کے بعد میں نے

بجّو کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے تھے۔

امّی کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک دیکھ کر مجھے بھی تعجب ہوا تھا اور تب امّی نے بتایا تھا کہ تسنیم صاحب جن کی لڑکی نیلو فر میری سہیلی تھی، شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں..... امّی نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں بجّو کی رضامندی لوں اور میں سوچ رہی تھی کہ تسنیم صاحب اور بجّو کا جوڑ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کہاں جوان بجّو کی دوشیزگی اور کہاں تسنیم صاحب کا بڑھاپا جن کی بیوی تپ دق کا شکار ہو کر تین سال پہلے مر چکی تھیں..... مجھے امی پر بڑا غصہ آیا تھا۔ مگر ابّو کی خمیدہ کمر اور امّی کے ماتھے پر ابھری ہوئی شکن کو دیکھ کر میں چپ رہ گئی تھی..... اسی رات جب بجّو میرے کمرے میں آئی تو گھنٹوں ہم مسہری پر لیٹے راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے وہ مجھ سے کرید کرید کر خالد کی شرارتوں کا حال پوچھتی رہیں.....

اچانک وہ مجھ سے لپٹ گئیں اور پاگلوں کی طرح مجھے پیار کرنے لگیں۔ میں گھبرا سی گئی۔ بجّو کے پیار سے آج مجھے عجیب سی کراہت آنے لگی۔ نہ جانے کیا سوچ کر میں خوف زدہ ہو گئی اور میں نے بجّو کو پرے دھکیل دیا۔ "یہ کیا بجّو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے بجّو کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کئے تیز تیز سانسیں لے رہی تھیں چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے نیلے ہوتے جا رہے تھے، یکایک بجّو کے لئے میرے دل میں ممتا کا جذبہ ابھر آیا تھا.....

بے چاری بجّو..... میں نے ان کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے

ہوئے کہا..... بجّو..... امّی نسیم بھائی سے تمہارا رشتہ کر رہی ہیں...
اور بجّو کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ گھبرا کر انھوں نے آنکھیں
کھولدیں..... کیسی وحشت برس رہی تھی ان آنکھوں سے.....
میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو بجّو کا سارا بدن کانپ اٹھا، جیسے
رعشہ طاری ہو گیا ہو اور وہ یک بیک اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
میں نے لاکھ ان کو پکارا مگر کمرے کا دروازہ نہ کھل سکا۔ اور میں باہر
دروازے سے بجّو کی خاموش سسکیوں کا تصور کر کے دل ہی دل میں
روتی رہی تھی.....

دوسری صبح سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا..... بجّو کی بے خواب
زندگی نے خواب آور گولیوں کا سہارا لے کر امّی اور ابّو کے پہاڑ جیسے
بوجھ کو ختم کر دیا تھا..... اب بجّو کو نیند نہ آنے کی شکایت نہ رہی
تھی..... بے قرار زندگی ابدی خواب میں کھو گئی تھی.... جوان لاش
گھر سے کیا نکلی امّی اور ابّو کے ارمانوں کا جنازہ نکل گیا تھا۔ جانے انہیں
سکون آ گیا یا اضطراب بڑھ گیا، مگر میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی
جب خالد اور دوسرے لوگ بجّو کی لاش کو کندھوں پر اٹھائے گھر سے
باہر نکل رہے تھے۔ اور میں حسرت سے بجّو کے خالی پلنگ کی طرف تک
رہی تھی جس کے چادر پر پڑی بے شمار شکنیں، بجّو کے بے پناہ کرب
کی کہانی کہہ رہی تھیں..... صحن سے امّی کے بین کی آوازیں آ رہی
تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا بجّو کے مرنے کے بعد بھی چادر کی یہ

شکنیں ہمیشہ باقی رہیں گی۔

آج بجّو کو مرے ہوئے بیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ امّی اور ابّو نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے اور میں دالان کے تخت پر بیٹھی ماضی کے تانے بانے سلجھا رہی ہوں...... آنگن میں کھڑا نیم کا درخت آج بھی ویسے ہی نقرئی لباس پہنے جھوم رہا ہے...... میری دونوں بیٹیاں نصرت اور نزہت بجّو والے کمرے میں نہ جانے کیسی رازونیاز کی باتیں کر رہی ہیں...... میری بڑی لڑکی نصرت بالکل بجّو کی ہم شکل ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی نے نصرت کا حسن بھی چیچک کی نذر کر دیا ہے۔ اور بجّو کی طرح موٹی سی عینک بھی لگانے لگی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے بجّو کا خیال آجاتا ہے اور اس انجانے خوف سے کانپ اٹھتی ہوں۔ نزہت کی عمر ابھی صرف تیرہ سال کی ہے اور اس کے گھونگھریالے بالوں میں اپنی جوانی کا عکس ڈھونڈھتی رہتی ہوں۔

بجّو کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ نزہت نصرت کے گلے سے لگے جھول رہی ہے، اس کا دوپٹہ شانے سے سرک کر مسہری پر گر گیا ہے اور وہ عجیب شان بے اعتنائی سے نصرت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ یکایک کچھ سوچ کر میں جھنجھلا اٹھتی ہوں اور بجّو والے کمرے میں داخل ہو کر نزہت پر برس پڑتی ہوں۔

"نزہت دوپٹہ ٹھیک کرو۔ کنواری لڑکیوں کے یہ ڈھنگ نہیں ہوتے۔ اللہ، ایک ہمارا زمانہ تھا کہ دوپٹہ......"

یکایک مجھے ددّابی یاد آجاتی ہیں اور میں خاموش ہو جاتی ہوں۔
نزہت گھبرا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور نصرت بھی اس اچانک کی بوچھاڑ سے چونک جاتی ہے۔ غیرارادی طور پر میری نظر بستر کی چادر پر پڑ جاتی ہے۔ جس پر پڑی بے شمار سلوٹوں کو دیکھ کر میں کانپ اٹھتی ہوں اور مجھے بجّو کا بستر یاد آجاتا ہے ......

خدایا! کہیں بستر کی یہ سلوٹیں" نصرت کے ماتھے پر نہ ابھر آئیں۔ اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

—— آجکل، دہلی

منتخب افسانے

جبھی سراج کی آواز نے مگن لال کو چونکا دیا۔

"ہیلو، سویٹی پائی......"

سراج تقریباً ان پڑھ تھا، مگر ٹورسٹوں کے ساتھ رہنے سے اُسے انگریزی سیکھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے مگن سمجھ گیا، کیرتی آئی ہے۔

وہ سچ مچ کیرتی ہی تھی، جو چھوٹے قد، گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی ایک اُداس لڑکی تھی۔ اس کا رنگ پکا تھا، پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑا متشکل ہو کر سامنے آگیا۔ وہ ہمیشہ رات ہی کو آتی تھی، جیسے اُسے اپنا آپ چھپانا ہے۔ سراج اپنی دوکان کے سامنے کھڑا تھا اور کیرتی ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھے، اس سے بات کئے بغیر نکل آئی تھی اس کے باوجود وہ سیٹیاں بجا رہا تھا۔

مگر کیرتی بات ہی کہاں کرتی تھی۔ اللہ سے، اُس سے، کسی سے بھی نہیں اس سے بات کرنے کے لئے سوال کچھ یوں وضع کرنے پڑتے تھے کہ ان کا جواب ہاں ہو یا نہ۔ صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سر ہلانے سے بات بن سکے۔ سراج کا اُسے چھیڑنا مگن کو بہت ناپسند تھا۔ اُس نے کئی بار مگن سے کہا بھی تھا: "تو کہیں عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا۔ میرے یار! جوان لڑکی ہے، کھینچ ڈال۔ بہت اِدھر اُدھر رہا کئے کبوتر کی طرح سے تو وہ اُڑ جائے گی"۔ لیکن مگن نے اِسے ڈانٹ دیا تھا۔

درحقیقت مگن ٹھکلے کا دھندہ سد باب ہونا تھا۔ کیرتی کوئی لکڑی کا کام شلپ بنا کر بیچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی تو وہ اس میں بہت کیڑے نکالتا

کبھی کہتا ایسی چیزوں کی آج مانگ ہی نہیں اور کبھی یہ کہ وہ فن کے معیار و لچک پہ پوری نہیں اترتیں۔ کیرتی اور بھی منہ لٹکا لیتی، حالانکہ ان سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہوتا کہ وہ سو کی چیز پانچ دس میں دے جائے اور پھر اُسے سیزن کر کے سینکڑوں میں بیچے۔

کیرتی نے یہ کام کسی آرٹ اسکول میں نہ سیکھا تھا۔ اس کا باپ نارائین ایک شلپی تھا۔ وہ بھاؤ واجی اور جیمز برگس وغیرہ کے ساتھ نیپال اور جانے کہاں کہاں ہندوستان کی وراثت کو ڈھونڈتا پھرا تھا جو کہ در اصل لندن کے میوزیم، نیویارک اور ٹوکیو کی بنک کی دکانوں میں رُل رہی تھی۔ ہر سال ہمارے مندروں اور دھرم خانوں سے سینکڑوں مورتیاں غائب ہوتیں اور ہزاروں میل دور ٹوکیو وغیرہ کی دکانوں میں جگہ پاتیں۔ نارائین مسلسل سفر سے تنگ آ کر لوٹ آیا تھا اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیئے تھے، جنھیں کیرتی بڑے انہماک سے دیکھتی اور بیچ میں اوزار پکڑا دیتی اور رف ورک کرنے میں باپ کی مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر بیٹھ جانے میں نارائن اس بات کو بھول ہی گیا تھا کہ لکھا ہوا اور نہ پائے ہوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے دُگنے چوگنے ہی نہیں سو گنے دام ملتے ہیں۔ شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی ماہیت کو سمجھ جاتے ہیں۔ اور زندگی کو پھیلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بناتا اور مشکل سے روٹی کماتا تھا۔ آخر ایک دن دو مردوں کے درمیان اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ جگہ جما کا بُت بنا رہا تھا جب کہ اُس کا اپنا ہی چھینی اس کے ہاتھ میں لگ گیا جس سے ٹیٹنس ہو گیا اور وہ قریب کی چھاؤنی کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتنے کی

مرتّبین:
شہبار حسین
بدیع الزماں

۱۹۶۸ء کے منتخب

پہلی بار : جنوری ۱۹۶۸ء
سرورق : انوار انجم
خوشنویس: رہبر الماسی رامپوری
طابع : یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶
زیرِ اہتمام: فضل الرزاق
قیمت : چار روپے

موٹا مرا۔ کیوں نہ ایسی موت مرتا؟ —— جب وہ دیوی کا بُت بناتا تھا تو دونوں، ہتھیلیوں اس کی چھاتیوں، اس کے کولہوں اور رانوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیاں خلا میں گھستے ہوئے لٹو معلوم ہوتی تھیں لیکن بڑوں میں ٹانگیں اور دھڑ سو ایک طرح کی گھڑونچی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے مٹکے تھے جو اُس پہ رکھے ہوئے تھے۔ اور کولھے ہتھنی کے ماتھے کی طرح سے جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سونڈیں نکلتی تھیں۔ اُس نے دُرگا کا شلپ بھی بنایا تھا جو بڑی جبرجنگ دیوی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے نارائین کتے کی نہیں تو کیا ہماری آپ کی موت مرتا؟۔

"کیا لائی ہو؟" مگن ٹکلے نے کیرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنے دھوتی کے پلو سے لکڑی کا کام نکالا اور دھیرے سے اسے مگن کے سامنے رول ٹاپ کی میز پر رکھ دیا، کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے مگن نے ایک بیرونق کرسی کیرتی کے سامنے سرکا دی۔ مگر وہ بدستور کھڑی رہی۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں سڑک نیچے گرتی تھی۔ اور جب چہرہ مگن کی طرف کیا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھاؤنی کے اسپتال میں پڑی تھی، جہاں اس کے باپ نارائن نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو مقعد کا سرطان تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کرکے ایک نلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بوتل باندھ دی تھی تاکہ بول وبراز

نیچے جانے کے بجائے اوپر بوتل میں چلے جائیں۔ پہلی بوتل کسی وجہ سے خراب ہوگئی تھی اور اب دوسری کے لئے پیسے چاہیئے تھے۔ اگر وہ مگن کو بتا دیتی تو وہ شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس ڈڈورک کو دیکھ کر وہ ویسے ہی بھڑک گیا تھا۔

"پھر وہی" اس نے کہا "میں نے تم سے کئی بار کہا ہے، آج کل ان چیزوں کو کوئی نہیں پوچھتا —— یہ لیٹے ہوئے وشنو، اوپر شیش ناگ —— لکشمی پاؤں داب رہی ہے......"

کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے مگن کی طرف دیکھا، جن میں سوال تھا —— اور کیا بناؤں؟

"وہی —— جو آج کل ہوتا ہے"

"آج کل....... کیا ہوتا ہے؟" کیرتی نے آخر منہ کھولا مشکل سے اس کی آواز سنائی دی، جیسے کینری (Canary) کی چونچ ہلتی دکھائی دیتی ہے مگر آواز سنائی نہیں دیتی۔

مگن نے کچھ رکتے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا "اور کچھ نہیں ہوتا تو گاندھی ہی بناؤ۔ نہرو بناؤ —" اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے بولا "کوئی نیوڈ......"

"نیوڈ؟"

"ہاں —آج کل لوگ نیوڈ پسند کرتے ہیں"

کیرتی چپ ہوگئی۔ کنواری ہونے کے ناطے وہ شرما سکتی تھی لجا سکتی تھی، مگر یہ سب باتیں اس لڑکی کے لئے تعیش تھیں۔ اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی

کہ مگن اس وڈورک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں؟ کچھ سوچتے، رُکتے ہوئے اُس نے کہا ___ "مجھے نہیں آتا،"

"کیا بات کرتی ہو؟ تمہارے باپ نے بیلیوں بنائے"

"وہ تو ___ دیوی ماں کے تھے"

"فرق کیا ہے؟" مگن ٹکلے نے کہا "دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ مگر بھگوان کے لئے کوئی دیو مالا اُس کے ساتھ مت کرو ___ ان ہی حرکتوں سے تو تمہارے پتا ایسی موت مرے ___ سُرگباش ہوئے"

کیرتی نے اپنے جیون کے پچھواڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، جیسے وہی جانتی تھی، کوئی دوسرا نہیں۔ پھر بھی وہ بیروق کرسی پر بیٹھی نہیں، اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین سگر جادھانہ خط دکھائی دے رہے تھے۔ کیا تناپ تھا۔ جسے اوپر کے نہیں نیچے کے نارائن نے بنایا تھا۔ مگن لال کے دماغ میں اختیار اور بے اختیاری آپس میں بزد آزما ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ برابر والی لڑکی کے اندر بھی وہی چارہ اور لاچاری آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ اس کا منھ سوکھ گیا تھا۔ کوئی گھونٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ بولی ___

"ہیں ___ میرے پاس موڈل نہیں"

"موڈل؟" مگن نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا "سینکڑوں ملتے ہیں آج تو کسی بھی جوان، خوبصورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایک دم ___"

کیرتی نے کچھ کہا نہیں، مگر مگن نے صاف سُن لیا ـــ "پیسے؟" اور خود ہی کہنے لگا ـــ "آدمی پیسہ خرچ کرے تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا"

اس بات نے کیرتی کو اور بھی اُداس کر دیا۔ اس کی روح زندگی کے اس جبر کے نیچے پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے، جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے چنانچہ مگن نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ اسے باہوں میں لے لے اور چھاتی سے لگا کر کہے ـــ "میری جان، تم فکر نہ کرو.... میں جو ہوں" لیکن کیرتی نے اسے جھٹک دیا۔ مگن کٹ گیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تُرپ اس کے ہاتھ میں تھا رول ٹاپ پر سے اس نے ورک کو اٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے اس کی ضرورت نہیں"

جب تک کیرتی نے بھی کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے پہلے نیچے دیکھا اور پھر ایکا ایکی سر اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی "ـــ اگلی بار زیور ہی لاؤں گی۔ ابھی تم اسے ہی لے لو"

"شرط ہے؟" مگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر ہلا دیا۔ مگن کو جھٹکے کا خیال تھا، کیرتی ہنس پڑے گی مگر وہ تو کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے رول ٹاپ کو اُٹھایا اور میز کے اندر سے دس روپے کا چُرمُرا سا نوٹ نکالا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا "..لو۔"

"دس روپے؟" کیرتی نے کہا۔

"ہاں ـــ تمہیں بتایا نا، میرے لئے یہ سب بیکار ہے، میں اور نہیں دے سکتا"

"ان سے تو —" اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی، الفاظ سب ٹھٹک گئے تھے۔ پھر مطلب صاف تھا۔ مگن سمجھ گیا۔ "اس سے تو بوتل بھی نہ آئے گی" "دوا کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا" . . . . . "روٹی بھی نہ چلے گی" قسم کے فقرے ہوں گے، سب مجبور اور نادار جن کی تتے کیا کرتے ہیں۔ اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — "مجھے بس دو، لادو تو میں اچھے پیسے دوں گا؟"

اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی دو انگلیوں کا چھلا بنایا، تھوڑی آنکھ ماری جیسے ڈوم، سازندے نائیکہ کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔

کیرتی باہر نکلی تو اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے وہ تھوڑا ہانپ رہی تھی۔ لوٹتے پر کیرتی ہمیشہ الٹی طرف سے جاتی تھی، حالانکہ اس میں اسے میل ڈیڑھ میل کا چکر پڑتا تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی سراج سے اس کی ٹکر ہو۔ لیکن آج وہ اس طرف سے گئی، جیسے اس میں کوئی مدافعت ابھر آئی تھی۔ مانک چلا آیا تھا اور سراج کے ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا، جبکہ کیرتی منہ اوپر اٹھائے، ناک پھلائے ہوئے پاس سے گزر گئی۔ سراج نے کچھ کہا جو مگن کو سنائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی جذبہ تھا اور یا پھر وہ ان مصیبت زدہ لوگوں میں تھی جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سوچتے ہیں — مبادا انھیں سے کوئی کام آپڑے، یا شاید یہ عورت کی فطرت کا خاصہ تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہے، جس نے اسے کچھ لینا دینا نہیں صرف اس لئے کہ اسے دیکھ کر ایک بار اس نے سیٹی بجائی یا اپنی چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر مردانہ آہ بھری تھی۔

سراج ضرور کوئی "ایفرڈ ڈیزیاک" کھا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے پاتے ہوں جو

مائیکل اسی کے لئے لایا تھا۔ شاید وہ دونوں مل کر مگی ٹیکلے کے پاس آتے اور اسے کچھ داؤ گھات بتاتے لیکن مگی نے دوکان ہی بڑھالی تھی۔ دروازوں کو اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے کیرتی کے ڈوورک کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ شیش ناگ کا نچلا حصّہ تو خوبصورت تھا ہی لیکن اوپر اس کی چتکبری کھال میں اس نے حرف گو دنوں سے رنگ بھر دیئے تھے۔ وشنو میں وہی تھا جو کوئی بھی عقیدت مند عورت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ لکشمی ڈھیری سی پڑی تھی اور اس کے بدن کے خط واضح نہ تھے۔ شاید کیرتی لکشمی کو اس کے کسی بھی روپ میں نہ جانتی تھی حالانکہ اسے دیکھ بنانا کتنا آسان تھا۔ جب عورت پاؤں دبانے کے لئے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ بازو بدن سے الگ ہوتے ہیں اور مخصوص عورت صاف اور سامنے دکھائی دیتی ہے۔ پھر پہلو پہ بیٹھی ہوئی اوپر کی عورت نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے اور مرد کی نظروں کو کیا کیا اونچ نیچ سمجھاتی ہے۔ اگر یہ کہیں کیرتی خود عورت تھی اس لئے عورت کی بہ نسبت اسے مرد میں زیادہ دلچسپی تھی تو یہ غلط ہو گا کیونکہ عورت اپنے حُسن کے سلسلے میں اوّل اور آخر تک خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کی یہ خود پرستی اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو کسی بھی مرد کی مدد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

مگی نے کیرتی کے ڈوورک کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے میں چاقو لے کر اس پہ "سدھم نمہ" کے الفاظ کندہ کر دیئے اور پھر پچھلے کمرے میں پہونچ گیا جہاں کچی زمین تھی، جسے کھود کر اس نے وڈورک کو نیچے رکھا، ایک اور مورتی کو نکالا جو کیرتی ہی کی بنائی ہوئی تھی اور پھر گڈھے میں مٹی ڈال کر اس پر کنٹھے کا پانی

چھڑک دیا۔ پُرانے بُت کی مٹی جھاڑ کر اسے دیکھا تو بڑی بڑی دراڑیں اس میں چلی آئی تھیں اور وہ صدیوں پُرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن جب وہ اسے لے کر ٹورسٹوں کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مگن نے انھیں بتایا کہ اس کا ذکر کالیداس کے رگھو ونش میں آتا ہے۔ رگھو جی نے کونکن کے علاقے میں ترکٹ نام کا ایک شہر بسایا تھا، جہاں سے یہ بُت برآمد ہوئے۔ کچھ میسور کے چار راجہ وڈیار کے پاس ہیں اور کچھ اپنے پاس۔ چنانچہ اس بُت کو مگن ٹکلے نے ساٹھ پانسو روپے میں بیچ دیا، جس کے لئے اس نے کیرتی کو صرف پانچ روپے دیئے تھے۔

اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر اندر کیرتی نیوڈلے آئی۔ وہ بدستور بدحواس تھی۔ اس کی ماں تو بیمار تھی ہی، وہ بھی بیمار ہو گئی تھی۔ اسے قریب قریب نمونیہ ہو رہا تھا۔ وہ کھانس رہی تھی اور بار بار اپنا کلیجہ پکڑ رہی تھی جس پر اس نے روئی کا ٹکڑا ایک پھٹے پُرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کی طرح سے شلپ کو مگن ٹکلے کے سامنے رکھا۔ اب کے اس نے اسے لکڑی میں نہیں، پتھر میں بنایا تھا اور وہ پھر اُمید و بیم کے ساتھ مگن ٹکلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگن اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹ ہوتا۔ اس لئے اس نے نہ صرف اسے پسند کیا، بلکہ جی بھر کر داد دی۔ اعتراض کیا تو صرف اتنا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ کاش وہ اسے قدِ آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود مگن کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔

اس نے "شلپ بکشی" کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی سچ مچ کا نیوڈ نہ بنا سکی تھی۔ بدن کے بدن پر کپڑا تھا جو گیلا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کہیں علیحدہ۔ بظاہر چھپانے کے عمل میں وہ عورت کے جسم کو اور بھی عیاں کر رہا تھا۔

شلپ پر سے نظر ہٹا کر مگن ٹکلے نے کیرتی کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ۔۔۔ "واہ!" کیرتی جھینپ گئی اور اس جامنی ساری کو آگے کھینچ کر پیچھے ڈھانپنے لگی لیکن مگن سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہو کر خود کو آئینے میں دیکھتی اور اسے بناتی رہی ہے۔ کئی بار اس نے کپڑا بھگو کر اپنے بدن پہ رکھا ہوگا جس سے اسے سردی ہو گئی اور اب وہ کھانس رہی ہے۔ یہ صرف پیسے ہی کی بات نہیں عورت میں نمائش اور خود سپردگی کا جذبہ بھی تو ہے۔ مگن سب سمجھ گیا تھا مگر تجاہل برتتے ہوئے اس نے پوچھا "ماں کیسی ہے؟"

کیرتی جیسے ایک دم برافروختہ ہو گئی۔ اسے کھانسی کا فٹ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگی۔ مگن گھبرا گیا تھا اور شرمندہ بھی تھا۔ اس کے بعد سر ہلاتے ہوئے جو اس نے سوال کیا، وہ بھی غیر ضروری تھا ۔۔۔ "تو موڈل مل گیا تمہیں؟"

کیرتی نے پہلے تو نظریں گرا دیں اور پھر دوکان سے باہر اس طرف دیکھنے لگی جہاں سڑک آسمان کو چھوتی ہوئی ابھا ایکی نیچے گرتی تھی مگن نے چاہا اسے اس کمزوری کے عالم میں پکڑ لے اور وہ داد دے جس کی وہ مستحق تھی اور جو شاید وہ چاہتی بھی تھی۔ مگر اس نے سوچا، ایسے میں دام بڑھ جائیں گے۔ اس نے اپنے دل میں اب کے کیرتی کو سو روپئے دینے کا فیصلہ کیا۔ بوتل اور باقی کی چیزیں شاید

سوکی نہ ہوں۔ مگر وہ سوہی دے گا۔ اندر ہی اندر وہ ڈر بھی رہا تھا کہیں کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کر دے۔

"کیا دام دوں اس کے؟" اس نے یوں ہی سرسری طریقے سے پوچھا' کیرتی نے اچٹتی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "اب کے میں پچاس روپے لوں گی۔"

"پچاس؟"

"ہاں — پائی کم نہیں"

مگن نے تسکین کے جذبے سے رول ٹاپ اٹھایا اور چالیس روپے نکال کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے اور بولا "جو تم کہو — مگر ابھی چالیس ہی ہیں میرے پاس۔ دس پھر لے جانا۔"

کیرتی نے روپئے ہاتھ میں لے لئے اور کہا — "اچھا"

وہ جانے ہی والی تھی کہ مگن نے اسے روک لیا۔ — "سنو" کیرتی گت کے بیچ رُک کر اس طرف "مجھے تھام لو" کے انداز میں دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر اُداسیاں چھٹ جانے کی بجائے کچھ اور گھنڈ گئی تھیں جبکہ مگن ٹکلے نے پوچھا "اتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائے گا؟"

کیرتی نے سر ہلا دیا اور پھر ہاتھ پھیلائے جس کا مطلب تھا — اور کیا کرنا؟ پھر اس نے بتایا — ماں کا آپریشن آ رہا ہے، جس کے لئے سینکڑوں روپئے چاہئیں۔

"میں تو کہتی ہوں" اس نے کہا اور پھر کچھ رُک کر بولی "ماں جتنی جلدی مر جائے اتنا ہی اچھا ہے" اور پھر وہ وہاں کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

آخر وہ خود ہی بول اٹھی "ایسے ایڑیاں رگڑنے سے تو موت اچھی"۔

جب مگن نے اس سے آنکھ نہ ملائی تو کیرتی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چھیالیس کی بھرپور عورت نظر آنے لگی، جو زندگی کا ہر وار اپنے اوپر لیتی اور اسے بیکار کر کے پھینک دیتی ہے۔

"ایک بات کہوں؟" مکلے نے پاس آتے ہوئے کہا "تم منتقن بناؤ آپریشن کا سب خرچہ میں دوں گا"۔

"منتقن؟" کیرتی نے کہا اور لرز اٹھی۔

"ہاں" مگن بولا "اس کی بہت مانگ ہے، تورسٹ اس کے لئے دیوانے ہوتے ہیں..."

"لیکن ـ"

"میں سمجھتا ہوں" مگن نے سر ہلاتے ہوئے کہا "تم نہیں جانتی تو ایکبار کھجوراہو چلی جاؤ اور دیکھ لو میں اس کے لئے تمہیں پیشگی دینے کو تیار ہوں"۔

"تم؟" کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولی "تم تو کہہ رہے تھے تمہارے پاس اور پیسے نہیں؟"

مگن نے فوراً جھوٹ تراش لیا۔

"میرے پاس بچے پیسے نہیں" وہ بولا "میں نے دوکان کا کرایہ دینے کے لئے کچھ الگ رکھے تھے....."

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی، مگر کیرتی نے اپنے زعم میں نہ لئے اور وہاں سے چلی گئی۔ مگن مکلے نے لوٹ کر "مہالکشمی" کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی

افسانے

ناشر: نازش بک سنٹر
۳۲۰۷ پھاٹک تیلیاں، دہلی ۶

سی ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑ دی پھر ٹانگ توڑ دی اور اس کے سر کے سنگار پہ ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں جس سے کچھ کرچیاں گر گئیں۔ پھر اندر جا کر اس نے اُسے رسی میں باندھا اور نمک کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے اُٹھے۔ بگن نے رسی کو کھینچا اور لکشمی کو نکال کر پانی میں ڈال دیا۔ اب جو اسے نکالا تو "لکشمی" کے خد و خال دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں بیچ میں سوراخ چھ سات سے پڑ گئے تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپیے میں بکنے کے لئے تیار تھی۔

اب کیرتی جو شلپ لائی وہ منقش ہی تھا۔ اور قد آدم۔ وہ ایک بوری میں بندھا ہوا، ٹھیلے پہ آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اُٹھا کر اسے مگن ٹھکلے کی دکان پہ رکھا۔ پھر اپنی مزدوری لے کر وہ لوگ چلے گئے۔

کیرتی اور خود کو تنہا پا کر، تیز سانسوں کے بیچ بگن ٹھکلے نے بوری کی رسیاں کاٹیں اور کچھ وارفتگی سے ٹاٹ کو شلپ پر سے ہٹایا۔ اب شلپ سامنے تھا — پرفیکٹ۔۔۔ بگن نے اسے دیکھا تو اس کے گلے میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس کے سامنے اس شلپ کو نہ دیکھنے دے گی، مگر وہ وہیں کھڑی تھی اس کے سامنے، کسی بھی ہیجان سے عاری، شلپ میں کی عورت تکمیل کو پہونچ رہی تھی جبکہ مرد خود رفتگی کے عالم میں اسے دونوں کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھا، جسے مگن ٹھکلے نے توجہ سے نہ دیکھا۔ وہ شاید اسے فرصت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

"کتنے پیسے چاہئیں، آپریشن کے لئے؟" اس نے پوچھا۔

"آپریشن کے لئے نہیں — اپنے لئے۔"

"اپنے لئے؟ — ماں.....؟"

"مرگئی — کوئی ہفتہ ہوا۔"

مگن نے اپنے چہرے پہ دکھ اور افسوس کے جذبے لانے کی کوشش کی، مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بھنچے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی اداس تھی جب کہ اس نے کہا — "بس اس کا ہزار روپیہ لوں گی۔"

مگن بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی — "اس کے ہزار روپئے بھی کوئی دے سکتا ہے۔"

"ہاں" کیرتی نے جواب دیا "میں بات کر کے آئی ہوں..... شاید مجھے زیادہ بھی مل جائیں، لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا"

"میں تو...... میں تو پانسو دے سکتا ہوں۔"

"نہیں" اور کیرتی نے مزدوروں کے لئے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ مگن جھکے نے اسے روکا — "سو دو سو اور لے لو۔"

"ہزار سے کم نہیں"

مگن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیور ہی دوسرے تھے کیا وہ کھچرا ہو گئی تھی؟ ٹورسٹوں سے ملی تھی؟ کسی بھی قیمت پہ کلاکار کو اس کی مارکیٹ سے جدا دکھنا چاہئیے...... مگر خیر...... اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور آٹھ سو کے نوٹ گن کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے کیرتی نے جلدی سے گنے اور اس کے منہ پر پھینک دیئے۔

"یہ میں نے کہا نا۔ ہزار سے کم نہ لوں گی"

"اچھا ــــ نو سو لے لو"

"نہیں"

"ساڑھے نو سو ــــ نو سو پچھتر۔۔۔۔ اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر اس نے سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور نشے کی حالت میں مجسمے کی طرف لپک گیا۔ کیرتی کھڑی تھی جیسے وہ اپنے فن کی داد لینے کے لئے ٹھٹک گئی تھی۔ مگن نے مجسمے میں کی عورت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ کیا وہ لذت کی گرانباری تھی یا کسی جبر کا احساس؟ کیا وہ دکھ اور سکھ، درد اور راحت کا رشتہ تھا جو کہ پوری کائنات ہے؟ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بے حد کثیف۔ کیوں، کیرتی نے کیوں مرد ــــ انسان کی "حماریت" پہ زور دیا تھا؟۔۔۔۔ یہ مجسمہ ہے۔۔۔۔ مگر وہ مجسمہ ہے۔۔۔ مگر وہ مجسمہ تو نہیں، جو برش اور پر کرتی میں ہوتا ہے۔ ۔ ٹھیک ہے الٹا زیادہ پیسے ملیں گے۔۔۔۔۔۔

مگن ٹکلے نے اوپر کی بتی کو کھینچ کر پھر مرد کی طرف دیکھا اور بول اٹھا ــــ "یہ ــــ تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم ــــ" مگن نے جیبیں تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم سراج کے ساتھ باہر گئی تھیں؟"

کیرتی نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپڑ مگن ٹکلے کے منہ پہ لگا دیا اور نوٹ ہاتھ میں تھامے دوکان سے نکل گئی۔

ــــ کتاب، لکھنؤ

دیویندر ستیارتھی | پیرس کا آدمی

"وہ مردہ سمندر کو ریگستان میں دفن کر کے چلے گئے..... وہ پیرس میں پیدا ہوا اور اب دنیا کا سفر کر رہا ہے....."

یہ عبارت آندرے مائیکل کی قبر پہ لکھی ہوئی ہے۔

وہ کہتا ہے: "یہ میں نہیں ہوں، آندرے ہے۔"

"آندرے کون؟" میں پوچھتا ہوں۔

وہ دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں بینک کے پاس چائے والے کی دکان ہے اور دھوئیں نے ایک تصویر بنا دی ہے۔

"یہ آندرے کی تصویر ہے۔" کزان کہتا ہے۔

یہ تصویر ہمارا راستہ نہیں روکتی، اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

"اس روز آندرے نہیں مرا تھا، میں مرا تھا۔" وہ کہتا ہے

"آندرے کون؟" میں پھر پوچھتا ہوں اور وہ ہنس کر بات ٹال دیتا ہے۔

ریگستان یہاں سے ڈھائی سو میل ہوگا اور سمندر ہزار میل سے کم نہیں۔ آندھی چلتی ہے تو ریگستان شہر میں پہنچ جاتا ہے اور گھروں میں صفائی کرتی

ہوئی عورتوں کی زبان پہ جانے کیسی کیسی گالیاں آجاتی ہیں، اور جب بارش ہوتی ہے تو سب کی نگاہوں میں سمندر گھوم جاتا ہے۔ لیکن عورتوں کی زبان پر پھر وہی گالیاں۔

سینما گھروں سے نکلتی ہوئی بھیڑ کبھی آندھی کا سامنا کرتی ہے کبھی بارش کا۔ عجیب جوڑ توڑ کی بھیڑ ہوتی ہے، جیسے سب اٹھائی گیرے ہوں۔

آندھی آتی ہے تو وہ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ دیکھو اونٹ پر سوار بوڑھا مسافر آگیا۔

میں کہتا ہوں "کزان، تم — تم ہی ہو۔ یا پھر پیرس، جہاں فیشن بھی آئیفل ٹاور جتنا بلند اور انقلاب کا جھنڈا بھی۔ لیکن آندرے کون؟"

میں کامائنی کی کہانی سناتا ہوں اور کزان صوفیہ کا قصہ لے بیٹھتا ہے۔

"کون صوفیہ؟" یہ سوال میرے ہونٹوں پہ نہیں آتا۔ کسی طرح میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ جو اس روز مر گیا صوفیہ کا محبوب تھا۔

ہم سب جیب کترے ہیں یا گھس پیٹھیے۔ کسی کے پاس اپنی بات نہیں۔ یہ سنتے سنتے کان پک گئے کہ تصویر ہزار لفظوں کے برابر ہوتی ہے۔

جو پیرس دیکھ آیا ہے اور وہ بھی تین دن، وہ ایسے بات کرتا ہے جیسے پیرس میں ہی عمر گزاری ہو اور کزان جو پیرس کا آدمی ہے، پیرس کی تصویر چھپائے رہتا ہے۔

وہ بالزاک کی تعریف کرتا ہے، جو آدھ گھنٹے، بارہ گھنٹے، بیس گھنٹے نان سٹاپ کاغذ پر قلم چلانے کے لئے مشہور تھا۔ بیچ میں قلم کو آرام دیتا تو کالی کافی پینے

کے لئے اور کالی کافی وہ اپنے ہاتھ سے تیار کرتا تھا۔ کہتے ہیں وہ قلم کو بھی کافی پلاتا تھا۔

بالزاک کی کھڑکی کہاں سے کھل گئی؟ یہ سوچ کر مجھے غصہ آتا ہے۔

"ہوا یہ کہ اس روز آندرے کے ہاتھ میں بالزاک کی ایک کتاب تھی ــــ" وہ کہتے کہتے رک جاتا ہے۔ اور میں جھنجھلا کر پوچھتا ہوں "کزان تم آندرے کی بات کر رہے ہو یا بالزاک کی کتاب کی؟"

"ایسے ہوتے ہیں فرنچ لوگ۔ یہ ہے صوفیہ کا تکیہ کلام۔ آندرے نے بالزاک کی جو کتاب اٹھا رکھی تھی، اس میں سے سرک کر ہی یہ جملہ مجھ تک پہنچا تھا۔ آندرے نے اس کے نیچے لال یا نیلی پنسل سے نہیں، ہری پنسل سے نشان لگا رکھا تھا۔" وہ مسکراتا ہے اور میں یہ نہیں پوچھتا کہ آندرے نے ہری پنسل سے نشان لگانا ہی کیوں ضروری سمجھا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے، جب آندرے جیل میں تھا۔" وہ کہتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آندرے جیل میں کیوں تھا۔

آندرے کی کہانی کو میں اپنے اوپر عادی نہیں ہونے دینا چاہتا۔ میرے لئے تو کزان ہی کافی ہے۔

ایک کپ کافی پر ہی پورا دن گزر جائے یا کبھی وہ بھی نہ ملے میں حیران ہو کر سوچتا ہوں، کزان کیسی تپسیا کر رہا ہے۔ سات دن سے نہایا بھی نہیں۔

کبھی یونانی پنیر کی تعریف کرتا ہے، کبھی ترکی گھوڑے کی، کبھی مردہ سمندر کی مچھلیوں کی اور کبھی فارسی شعر سناتا ہے۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

میں یوں منہ بنا لیتا ہوں۔ جیسے میرا اس شعر سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ وہ آنکھیں نچا کر اور ہاتھ لہرا کر اس شعر کا مطلب سمجھاتا ہے کہ میرے یار کی زبان ترکی ہے اور میں ترکی نہیں جانتا۔

"اس دن برف گر رہی تھی۔" وہ کہتا ہے اور میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ اُس دن کی بات ہے، جب آندرے مرا تھا۔

"کیا وہ اخبار میں کام کرتا تھا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"تم نے کیسے مان لیا؟" وہ مسکراتا ہے اور صوفیہ کا قصہ شروع کر دیتا ہے۔

میں سمجھ جاتا ہوں کہ کزان کو صوفیہ کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے زیادہ دیر نہیں لگی۔ جیسے بالزاک کی کوئی کتاب ہو، جسے پہلے وہ پڑھ رہا تھا جو برف کے موسم میں مر گیا اور بعد میں وہ کتاب کزان کے ہاتھ آ گئی۔

ہم بار بار قسمیں کھاتے ہیں کہ اب کے ہم ووٹ بکنے نہیں دیں گے اور بڈھوں کی حکومت کو ختم کر کے ہی دم لیں گے لیکن جب ووٹ کا موسم آتا ہے تو ہمارے ووٹ پھر بک جاتے ہیں۔

جب سے وہ یہاں آیا ہے نہ سگریٹ کو ہاتھ لگاتا ہے نہ بیڑی کو۔ ہر وقت چلم لئے رہتا ہے۔ چلم میں تمباکو بھرتے ہوئے چرسی بابا کا نام لیتا ہے۔

شاید اس نے تمباکو کے ساتھ آج کچھ اور کچھ ڈال رکھا ہے۔

بات امرت شیر گل کی کسی تصویر کی تو نہیں ہو رہی ہے، نہ بڑے غلام علی خاں کے سنگیت کی میں نے اپنی ایک ٹریجڈی دے کر ایک کہانی لکھی ایک میگزین میں۔

میگزین گم ہوگیا اور جب وہ ملا تو اُسے آدھے سے زیادہ دیمک چاٹ چکی تھی۔
بھئی آنکھیں مت جھپکاؤ۔ کیا چرس کا نشہ شروع ہوگیا۔
ستمبر کے بعد اکتوبر آتا ہے۔ ہر سال یہی چکر چلتا ہے۔ وہی گالی گفتار وہی لزلزی داستان۔ کہنے کو یہی کہا جاتا ہے کہ شہر روم روم میں تناؤ محسوس کر رہا ہے۔
"شیطان کی آنکھ ریگستان" میں کہتا ہوں۔
وہ کہتا ہے "آندرے کسی جنازے کے ساتھ جانا پسند نہیں کرتا تھا لیکن جب بالزاک کی کسی کتاب میں کسی کی موت ہوتے دیکھتا تو ہفتوں اداس رہتا۔"
"یہ بات تو میرے بارے میں بھی سچ ہے" کزان" میں کہتا ہوں۔
میرے ہاتھ میں چلم تھما کر وہ مجھے یقین دلاتا ہے کہ چارکش لگانے سے پیرس کی آرٹ گیلری میں بالزاک کا بت نظر آسکتا ہے۔
پیرس سے بور ہو کر وہ بنارس پہنچا اور وہاں سے اکتا کر یہاں چلا آیا۔
میں سمجھ جاتا ہوں کہ بنارس میں چرسی بابا نے اُسے چرس کی لت لگادی اور وہ چلم اٹھا کر یہاں بھاگ آیا۔
داستان کو پھلانگ کر ہم تصویر کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور تصویر سے پیچھا چھڑا کر پھر داستان میں چلے آتے ہیں۔
اس نے صوفیہ کو خط لکھا تھا کہ پچاس ہزار جھگیاں سرکار نے جلا دیں۔ جیسے جنگل کا قانون لاگو کیا جا رہا ہو۔
میں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح کی باتیں صوفیہ کو لکھنے سے کیا حاصل۔ لیکن وہ یہ خط لکھ کر ہی مانا۔ میں نے سوچا، صوفیہ کو یہ خط ملے گا تو وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے

کر کے ہوا میں اچھال دے گی یا آتش دان میں پھینک دے گی. لیکن صوفیہ کا خط آیا تو کزان نے بتایا کہ صوفیہ نے جھگی والوں کے لئے گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے.

یہ بات ایسی نہیں کہ خود ہی چراغ جلایا اور خود ہی بجھا دیا.

گالی گفتار میں ہم شیطان کی عبادت کرتے ہیں. خود ہی کیمرہ مین، خود ہی ڈائرکٹر خود ہی پروڈیوسر. کبھی لونگ شاٹ، کبھی مڈ شاٹ، کبھی کلوزاپ، کبھی ہم گھوڑے کی نقل اتارتے ہیں، کبھی ہاتھی کی اور کبھی خرگوش کی. نقل ہی نقل. اصل کا تو محض نام ہے.

"وہ جو برف کے موسم میں مر گیا. سمجھوتہ کرنے کو غداری سمجھتا تھا." کزان میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کہتا ہے.

جامع مسجد کا کباڑی بازار دیکھنے کے لئے وہ ہفتہ بھر انتظار کرتا ہے اور پڑی پڑی ہوئی کتابوں میں بالزاک کی کوئی کتاب نظر آ جاتی ہے تو خوشی سے چلاتا ہے. بالزاک، بالزاک، بالزاک.

کباڑی بازار کی بھیڑ میں مجھے ہمیشہ بطخوں کی قیں قیں سنائی دیتی ہے، چیز بکتی کم ہے، بھاؤ تاؤ زیادہ ہوتا ہے. لگتا ہے ہر لمحہ آوازیں لمبی ہوتی جا رہی ہیں اور چہرے گڈ مڈ ہوئے بنا نہیں رہتے.

"آندرے نے اپنے آخری خط میں صوفیہ کو لکھا تھا کہ یہ بات میں نے بالزاک سے سیکھی کہ انسان وہی ہے جو اپنے آدرش کے ساتھ بے وفائی نہیں کرتا." کزان مسکراتا ہے اور ہمارے سامنے پیڑ آ جاتا ہے جس پر بجلی گر چکی ہے. تھوڑی خاموشی کے بعد وہ پھر کہتا ہے، "آندرے کی موت کے بعد میں صوفیہ کو اس بات پر راضی کرنے میں

کامیاب رہا کہ وہ مجھے اپنے محبوب کا دوست سمجھ کر میرے ساتھ ایڈجسٹ کرلے، وہ مان گئی لیکن میں بے وفا نکلا کہ اسے چھوڑ کر چلا آیا اور سچ تو یہ ہے کہ" ــــ وہ کہتے کہتے رک جاتا ہے۔

وہ بالزاک کا قصہ سناتا ہے جسے زندگی میں کسی نے عظیم نہیں مانا تھا۔ بالزاک کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر وکٹر ہیوگو نے پہلی بار بالزاک کے لئے عظیم لفظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا" آج ایک عظیم ادیب مرگیا" اور پھر گویا اپنی ہی بتائی ہوئی بات پر جھنجھلا کر کزان کہتا ہے" اٹ از آل ایبسرڈ"

وہ کالی کافی پیتا ہے اور بالزاک کی بات شروع کردیتا ہے، جسے نہ تمباکو سے الفت تھی نہ شراب سے۔ وہ تو بغیر دودھ کی کالی کافی کا رسیا تھا" کالی کافی دیوتاؤں کا ورد ان ہے" یہ تھا بالزاک کا تکیہ کلام۔ ناشتے کی پلیٹ لیکر نوکر اس کے کمرے میں اسی وقت داخل ہوتا جب گھنٹی بجتی۔ ٹھیک صبح کے آٹھ بجے اسے ہدایت تھی کہ وہ ناشتے کی پلیٹ میز پر رکھ کر پہلے چاندی کے شمع دان سے ساتوں موم بتیاں بجھائے، پھر تینوں کھڑکیاں کھولے۔ تب بالزاک کاغذ سے سر اٹھا کر نوکر سے کہتا" ہیلو۔۔۔۔" نوکر کو ہدایت تھی کہ وہ آداب بجا لانے کی زحمت نہ اٹھائے۔

جب کزان غصہ میں ہوتا ہے تو بالزاک کو بھی فراڈ کہہ ڈالتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے۔ تو چلم کے چار کش لے کر کہتا ہے" پیرس کا سر ڈھول کی طرح بجتا ہے"

میں کہتا ہوں" کزان کچھ نہ ہونے کا احساس گلے میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے"

ترتیب

مُتھن	راجندر سنگھ بیدی	۱۷
پیرس کا آدمی	دیوندر ستیارتھی	۳۵
اسکوٹر والا	جیلانی بانو	۵۷
ادھوری تصویر	شرون کمار ورما	۷۱
عجائب سنگھ	الیاس احمد گدی	۹۰
قالین	اقبال متین	۱۰۹
سائے کا سفر	عوض سعید	۱۱۶
ٹوٹتے سائے	بدیع الزماں	۱۲۱
تلاش	ویریندر	۱۳۶
ایک دن کا سلطان	مانک ٹالہ	۱۴۷
سایۂ رم آہو	احمد یوسف	۱۵۷
سلوٹیں	س رش مشہدی	۱۶۷

"اٹ از آل ایبسرڈ" وہ کھل کھلا کر ہنستا ہے۔

ہم ہر بات کو اول جلول سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہ آج کل کا فیشن ہے۔ لیکن بڑے غلام علی خاں تو سنگیت کو اول جلول نہیں سمجھتے تھے، نہ امرتا شیر گل کینوس پر برش چلاتے ہوئے تصویر کو اول جلول سمجھتی تھی۔

نومبر کے بعد دسمبر آتا ہے۔ راستہ وہی، مسافر وہی۔

"آندرے اور صوفیہ کی بات چھوڑو" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے "بالزاک کی یہی بات تھی، کسی لڑکی کو بانہوں میں بھر کر کہتا۔ ڈارلنگ! میں اتنی تیزی سے لکھتا ہوں کہ جملے ادھورے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ اکثر کمپوزیٹر اپنی طرف سے میرے ادھورے جملوں کو پورا کر ڈالتا ہے۔ اس لئے یہ میرا بیٹا بھی ہے اور دوست بھی اور گورو بھی..... اور وہ لڑکی کمپوزیٹر کے ہونٹ چوم لیتی۔"

جیب سے آئینہ نکال کر وہ اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ کندھوں پر لٹکتے ہوئے بال اور لمبوتری داڑھی، جس کا وجود محض ٹھوڑی پر ہے۔

میں کہتا ہوں "آندرے تو تم گیا، صوفیہ کہاں ہے؟"

وہ چلتے چلتے کہتا ہے۔

"صوفیہ پیرس کے ٹیلی ویژن میں کام کرتی ہے، اس کے کندھوں پر سنہرے بال لہراتے ہیں، چہرے پر دو نیلی جھیلیں ہیں جن میں مچھلیاں تیرتی ہیں، کوئی ان مچھلیوں کی تصویر نہیں بنا سکتا۔"

کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دن بھر میں ہم کتنا راستہ طے کر لیتے ہیں۔ پیرس، پیرس، پیرس، اس کی زبان پر پیرس کا نام رہتا ہے۔

"قصہ یوں ہوا کہ اس دن آندرے بالزاک کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔"

وہ کہتا ہے۔

میرے سامنے بالزاک کی وہ کتاب کھل جاتی ہے جس میں بوڑھا باپ اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھنے کے لئے ترس جاتا ہے جو اپنے شوہروں کے پاس رہتی ہیں۔

وہ کہتا ہے بالزاک کی طرح آندرے کو بھی کسی نے زندگی میں عظیم نہیں کہا تھا اور جب وہ مرا تو اس کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر ایک اداکار نے کہا۔ "آج ایک عظیم کرانتی کاری مر گیا۔"

سینکڑوں آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگتی ہیں۔ کتاب کے ہر صفحہ پر عورت چاہئے اور ہر تصویر میں عورت کی گولائیاں۔ چھاپنے والا بھی یہی چاہتا ہے اور پڑھنے والا بھی۔

ہر آدمی بک رہا ہے۔ کوئی اونچے داموں، کوئی نیچے داموں۔

دولت کی طلب، طاقت کی طلب، شہرت کی طلب، ہر طلب سمجھوتہ کرنے پر مجبور کرتی ہے اور جو سمجھوتہ کرتا ہے وہ سینے پر گولی نہیں کھانا چاہتا۔

وہ کہتا ہے۔ "وہ جو پیرس میں مر گیا اس روز، اس نے سینے پر گولی کھائی تھی۔ صوفیہ نے اسے تحریک میں حصہ لینے سے روکا لیکن آندرے کب رکنے والا تھا۔"

میں کہتا ہوں۔ "کہ ان کوئی سینے پر گولہ نہیں کھانا چاہتا لیکن زمین خون مانگتی ہے، اس روز جب پچاس ہزار جھگیاں جلائی جا رہی تھیں اور جھگی والوں کو ٹرک میں لاد لاد کر راجدھانی سے بیس میل کے فاصلے پر کھلی زمین میں چھوڑنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا اگر ہزار آدمی بھی سامنا کرنے پر تل جاتے تو گولی چل جاتی۔ لیکن

لوگوں نے یہ اتیاچار برداشت کرلیا۔ اسے کیا کہو گے؟"

وہ چلم کا کش لے کر ایک میگزین کے اوراق پلٹتا ہے اور میری نظریں گیلری کی تصویروں پر جم جاتی ہیں۔

بہت سے بُت کھڑے ہیں۔ ان میں بالزاک کا بت بھی ہے جس نے پیرس کو لالچ، سازش اور نفرت کا جنگل کہا تھا۔

کیا بُت تراش نے پیرس کی تنقید کرنے والے سے انتقام لیا ہے؟ انتقام لیا ہے؟ انتقام نہ لیا ہوتا تو اس کا پیٹ اتنا بڑھا ہوا کیوں دکھاتا؟ لگتا ہے پیرس کی تنقید کرنے والا پیرس کو دیکھتے ہوئے اسی طرح کھڑا رہے گا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور چہرے پر بڑھاپے کے آثار۔ آنکھوں میں پاگل پن کو چھوتی ہوئی تیز نظر۔ جیسے وہ بلیڈ سے کاغذ کاٹنے کی طرح ہر چیز کو کاٹ کر رکھ سکتا ہو۔

بالزاک نے کتنا کچھ لکھا۔ دن کو سوتا تھا، رات کو لکھتا تھا۔ پریس والے اس سے تنگ تھے۔ کیونکہ وہ سولہویں دفعہ پڑھے ہوئے پروفوں میں بھی اتنی تبدیلیاں کر ڈالتا تھا کہ اکثر پورے میٹر کو پھر سے کمپوز کرنا پڑ جاتا، اور پریس کو کئی گنا دام دینے پڑتے۔

"اٹ از آل ایبسرڈ" وہ ہنستا ہے۔

قلعے کے سامنے والے میدان میں بچوں کو بطخوں کے پیچھے دوڑتے دیکھ کر وہ کہتا ہے "ان بچوں کو کھانے کے لئے پنیر ملنا چاہیے۔ لیکن ان سے پوچھو، کیا بڑے ہو کر تم بھی بوڑھوں کو ہی ووٹ ڈالتے رہو گے؟"

کبھی آندھی سے ٹوٹ کر گرا ہوا پیڑ سڑک کے کنارے اپنی کہانی سناتا ہے، کبھی رشوت کے الزام میں کرسی سے اٹھائے ہوئے آدمی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

"چہرہ فرشتے کا، عادتیں بھکمنگوں کی۔ ایسی ہے ہماری سرکار۔" یہ الفاظ کئی بار میری زبان پر آتے ہیں اور ہم کندھے سے کندھا بھڑائے کھڑے رہتے ہیں۔

وہ کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر نیچے لکھ دیتا ہے — یدھ کا خوف۔

"آندرے یدھ کے خلاف تھا اور صوفیہ کی نیلی جھیلوں میں اکثر۔" وہ کہتے کہتے رک جاتا ہے اور چلتے چلتے میرا کندھا تھپتھپاتا ہے۔

ہر چوراہے میں پولس کے سپاہی کی طرح یدھ کا خوف کھڑا رہتا ہے۔ خود ہی کیمرہ مین، خود ہی ڈائرکٹر، خود ہی پروڈیوسر، ایسے میں یہ بات ذرا بھی دلچسپ نہیں لگتی کہ بالزاک سولہویں دفعہ پڑھتے ہوئے پروفوں میں تبدیلیاں کرڈالتا تھا۔ یا یہ کہ چرسی بابا نے تین شادیاں کیں اور پھر دنیا سے منہ موڑ کر انتو میدھ گھاٹ کی پہلی سیڑھی اپنا لی اور چرس کے نشے میں اس کی آنکھیں جوان لڑکیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

"صوفیا کی بیٹی گریٹا کا چہرہ آندرے کی طرح لمبوترا ہے۔" وہ کہتا ہے اور میں ہوں ہاں نہیں کرتا۔ وہ ہنستا ہے تو پاس سے آتی ہوئی لڑکیوں کی قیں قیں اس کی ہنسی میں ڈوب جاتی ہے۔

وہ میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیتا ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ بالزاک کے بارے میں پھر وہی بور کرنے والا قصہ نہ شروع کردے کہ وہ بیسویں بار پڑھتے ہوئے پروفوں کو بھی چاقو یا قینچی سے کاٹ کر آگے پیچھے چپکانے لگتا تھا۔

"ایسے ہوتے ہیں فرینچ لوگ —" میں کہتا ہوں "کمال کا چہرہ۔ نیلی آنکھیں

لمبی ناک، کندھوں پر لہراتے بال، ارے اگر تم یہ کھوڑی کا جنگل صاف کر ڈالو بلیڈ سے تو پتہ ہی نہ چل سکے کہ تم لڑکا ہو یا لڑکی۔"

وہ تیوری چڑھا کر غصہ ظاہر کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں " الو کی دم فاختہ" سڑک سے بھیڑوں کی لمبی قطار گزرتی ہے تو پانچ منٹ کے لئے راستہ رک جاتا ہے۔ وہ ہنس کر کہتا ہے " اب ہماری مصیبت کیا ہے کہ ہم کسی گڈریے کی بھیڑیں نہیں بن سکتے۔"

" ایسے ہوتے ہیں فرینچ لوگ۔" میں اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا ہوں "کزن میرا جی کیسے لگے گا جب تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے، جیسے تم چرسی بابا کو چھوڑ آئے۔"

" اٹ از آل ایبسرڈ" وہ مسکراتا ہے، جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ لگاؤ سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔

کسی کو کسی میں دلچسپی نہیں۔ ہر آدمی آپا دھاپی کا شکار ہے، نہ پیار کا کوئی ارتھ ہے، نہ ہمدردی کا، نہ کوئی کسی کا ہم سفر ہے، نہ ہم صنم، چار یاری جنڈال چوکڑی ہے۔

وہ کہتا ہے " فرانس میں بلبل نہیں ہوتی، لیکن آندرے صوفیہ کو بلبل کہا کرتا تھا، حالانکہ صوفیہ کو بلبل کہنا غلط ہے، کیونکہ وہ گاتی کم ہے اور قسمیں زیادہ کھاتی ہے۔ جب آندرے زندہ تھا تو اس کی دیکھا دیکھی صوفیہ کی بیٹی گریٹا کہہ اٹھتی تھی ممی! ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں، تم اتنی قسمیں نہ کھایا کرو، اور کبھی مجھ سے کہتی انکل کزان ممی کو قسمیں کھانے سے روکو۔"

اپنی بات اپنے ہی ڈھنگ سے کہی جانی چاہئے۔ اس پر ہم دونوں کی ایک

رائے ہے۔

چیکے سے بالزاک کا نام آجاتا ہے، اس نے یہی لکھا ہے: "ایسے ہوتے ہیں فرینچ لوگ جو اپنی بات اپنی زبان میں ہی نہیں اپنے ڈھنگ سے کہنے کے لئے نسل در نسل لڑ سکتے ہیں۔"

بالزاک نے یہ بات کس کتاب میں لکھی ہے وہ کچھ اتہ پتہ نہیں بتاتا میں بھی زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے میں بیس سال آگے بڑھ کر من ہی من میں کہتا ہوں: "اب میں زندگی کو نہ تو واقعات کا سلسلہ مانتا ہوں اور نہ چہروں کا البم۔ اب نہ لفظوں کے چہرے چونکاتے ہیں نہ اُن کی آواز، نہ ان کے معنی، سب اُول جلول ہے۔ کوئی سلسلہ نہیں سب ایبسرڈ ہے۔ نہ پیرس اور یونانی پینٹر میں کوئی رشتہ ہے، نہ کزان اور چری بابا میں، نہ صوفیہ اور آندرے میں، نہ بڑے غلام علی خاں کے سنگیت اور امرتہ شیر گل کی تصویروں میں۔ اب پیرس سے آیا ہوا آدمی مجھے اپنے ساتھ جامع مسجد کے کباڑی بازار کے چکر نہیں لگوا سکتا۔"

سڑک کی بجلی آف ہو جاتی ہے تو بلیک آؤٹ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ جیسے واقعی ہر چوراہے پر بدھ کا خوف کھڑا ہو اور پھر سڑک کی بتیاں جل اٹھتی ہیں۔

"جب آندرے زندہ تھا ایک رات پیرس کی بجلی تین گھنٹے تک آف رہی۔ صوفیہ اور گریٹیا ہمارے ساتھ تھیں۔" اور وہ یہ باتیں رک رک کر کہتا ہے: "پیرس کی قسم، صوفیہ کو ہر چوک میں بدھ کا خوف کھڑا نظر آتا ہے۔"

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے، جب صوفیہ کی بیٹی گریٹیا اپنی سہیلی للی کے ٹیلی ویژن پر

اپنی ممی کو ہر روز خبریں پڑھ کر سناتے دیکھا کرتی تھی۔ ان کا ٹیلی ویژن خراب ہو گیا تھا۔ ایک روز للی سے گریٹا کا جھگڑا ہو گیا تو گریٹا نے صوفیہ سے کہا۔ "ممی تم سب کے ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھ کر سنا نا لیکن للی کے ٹیلی ویژن پر بالکل نہیں"۔

ہر لطیفے کی اپنی آنکھ ہوتی ہے، جیسے آندھی طوفان کی۔ میری نظریں بالزاک کے بت پر جم جاتی ہیں وہ ہلکے سبز رنگ کے کاغذ پر لکھنے کا شوقین تھا۔ رات کو جب لکھنے بیٹھتا تو سفید رنگ کا ڈھیلا ڈھالا چغہ پہن کر کمر میں سونے کی زنجیر کس لیتا، جس سے صلیب کی بجائے قینچی اور چاقو لٹکتے رہتے۔

"اٹ از آل ایبسرڈ" وہ مسکراتا ہے۔

وہ بنارس میں ڈیڑھ سال گزار آیا ہے اور گنگا کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن یہ بات اسے عجیب لگتی ہے کہ لوگ مرنے کے لئے بنارس جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں "کزان یہ تو ایسے ہی ہے جیسے بوڑھا ہاتھی مرنے کے لئے موت کی وادی میں آکر بیٹھ رہتا ہے، جس طرح جیسے کی نشانیاں مردہ سمندر کی تہ میں پڑی ہیں ۔۔۔ باہر نکلنے کے انتظار میں"۔

کامائنی کے دروازے پر ہم دستک دیتے ہیں تو وہ ہمارا سواگت کرتی ہے اور ہماری آنکھوں میں بالزاک کی محبوبہ کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔

کٹ گلاس کے پیالوں میں کالی کافی انڈیلتے ہوئے کامائنی اس رات کا قصہ شروع کر دیتی ہے جب اسے رت جگا کرنا پڑا۔ رات بھر کوئی دستک دیتا رہا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی تو یہ آواز رک جاتی۔ اس آواز کے پیچھے کبھی وہ ہوٹل کے پچھواڑے جاتی کبھی سمندر کے کنارے پھر واپس آکر لیٹ رہتی اور دروازہ

پر برابر دستک ہوتی رہتی۔

"اس رات میں نے تین دفعہ کالی کافی پی تھی۔" کامائنی مسکراتی ہے۔

وہ کالی کافی کی چسکی لے کر کہتا ہے۔" اس رات آندرے نے بھی تین بار کالی کافی پی تھی جو برف کے موسم میں مارا گیا سینے پر گولی کھا کر۔"

"آندرے کون؟"

"وہ میں ــــ"

"آپ تو یہاں موجود ہیں۔"

"نہیں یہ میں نہیں ہوں آندرے ہے۔" وہ ہنستا ہے۔

سامنے کی دیوار پر ایک آئل پینٹنگ نے بہت سی جگہ گھیر رکھی ہے۔

"اس رات جب میں ایک پل کے لئے بھی سو نہیں سکی۔ یہ تصویر کوئی میرے کمرے میں چھوڑ گیا۔" کامائنی مسکراتی ہے۔

"یہ وہی ہوگا۔" وہ چلاتا ہے۔

ہم اٹھ کر تصویر کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کامائنی کہتی ہے۔" ایک راستہ پہاڑ کو جاتا ہے جہاں جنگل ہے دوسرا راستہ شہر کو جاتا ہے تیسرا راستہ سمندر کو اور چوتھا راستہ ــــ"

"چوتھا راستہ؟" وہ چلاتا ہے اور صوفے پر پاؤں پھیلائے بیٹھا چلم پیتا رہتا ہے۔

کامائنی مسکرا کر کہتی ہے۔

"جہاں چاروں راستے آکر ملتے ہیں۔ وہاں جانے کس کا مقبرہ ہے۔ مقبرہ

پہلے تیار کر لیا جاتا تھا۔ قبر بعد میں بنتی تھی۔ اس مقبرے میں کسی کی قبر نہیں ہے۔"

کزان کی نظریں تصویر پر جم جاتی ہیں۔ جیسے وہ اس مقبرہ میں اپنی قبر کی کلپنا کر رہا ہو۔

کامائنی پیرس کی بات شروع کر دیتی ہے۔ "دیکھئے جب میں پہاڑ جنگل اور سمندر والے شہر کی یاترا کے بعد پیرس پہنچی تو اندولن چل رہا تھا اور پولیس کو ہفتے میں پچاس بار آنسو گیس کا استعمال کرنا پڑا۔"

وہ ہوں ہاں نہیں کرتا، مسکراتا رہتا ہے۔

کامائنی اٹھ کر اندر جاتی ہے تو میں کزان کے کان میں کہتا ہوں۔ گرمی کے موسم میں کامائنی دن میں بیس بار نہاتی ہے اور سردی کے موسم میں دس بار مزے کی بات یہ ہے کہ جتنی بار کامائنی خود نہاتی ہے۔ اتنی ہی بار اپنے کتے کو بھی نہلاتی ہے۔"

سیڑھیوں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ جیسے وہ ہماری باتیں سمجھ رہا ہو۔

وہ ہوں ہاں نہیں کرتا۔ شبد تھرتھراتے ہیں اور ادھر اپنی بات نہیں کہہ پاتے۔

کامائنی واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے اور مسکرا کر کہتی ہے۔ "میں آئیفل ٹاور دیکھنے گئی تو بلندی سے تصویر کی طرح نظر آ رہے پیرس کو دیکھتے ہوئے میں نے سات بار اپنے جسم کی چٹکی لے کر اپنے آپ سے کہا — یہ میں ہی ہوں جو آئیفل ٹاور کی بلندی سے پیرس کا چہرہ دیکھ رہی ہوں۔"

وہ کچھ نہیں کہتا۔ چلم کے چار کش لگا کر دھوئیں کی بنتی مٹتی لکیروں کو دیکھتا رہتا ہے۔

کامائی لوچ دار آواز میں کہتی ہے: "جب سے پیرس سے واپس آئی ہوں میں تو یہی سوچتی رہتی ہوں کہ میں اپنی تصویر وہاں کیوں چھوڑ آئی۔"

"پیرس کو تو کسی تصویر کی ضرورت نہیں ہوتی۔" وہ چلّاتا ہے: "تم نے اپنی تصویر کہاں چھوڑی؟"

"پیرس کے پاگل خانے میں۔"

"پاگل خانے میں کس کے پاس؟"

"ایک بڑھیا کے پاس۔"

"کون بڑھیا؟"

"جو کہتی تھی، میرا بیٹا اخبار میں کام کرتا ہے۔"

"اور کیا کہتی تھی؟"

"کہتی تھی، بڈھوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے میرا بیٹا بڑی بڑی خبریں چھاپتا ہے۔"

"اور بھی کچھ کہتی تھی بڑھیا؟"

"کہتی تھی مردہ سمندر میں عیسیٰ کی ایک ایک نشانی ویسی کی ویسی موجود ہے اور جب مردہ سمندر سوکھ جائے گا تو ایک ایک کر کے عیسیٰ کی سبھی نشانیاں دنیا کے ہاتھ آئیں گی۔"

"کیا بڑھیا نے بتایا تھا کہ مردہ سمندر کب تک سوکھ جائے گا؟"

"بڑھیا نے کہا تھا جب تک بڈھوں کی حکومت ختم نہیں ہوتی مردہ سمندر کے سوکھنے کی کوئی امید نہیں۔ لیکن بڑھیا نے میری تصویر لے لی۔ بولی میں اسے

چند باتیں

اردو ادب کے بعض ناقدین کی رائے ہے کہ گذشتہ تیس پینتیس سال میں اردو افسانہ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور دنیا کے افسانوی ادب میں اس نے اپنی ایک امتیازی حیثیت بنالی ہے۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اردو میں اچھے افسانے بہت کم لکھے گئے ہیں اور خصوصاً ایسے افسانے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو روس، فرانس اور انگلینڈ کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی نچلی سطح کو چھوتے ہوں۔ اردو افسانے پر آغاز سے ہی مقصدیت حاوی رہی ہے۔ مقصدیت بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے بشرطیکہ وہ ادب کی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ میں سیاست کو ادب کی قلمرو سے جلاوطن کر دینے کے حق میں کبھی نہیں ہوں۔ سیاست انسانی زندگی اور معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس حیثیت سے ادب سے بھی اس کا گہرا رشتہ ہے۔ ادیب کا سیاسی نظریہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ادب اس پر یہ پابندی ضرور عائد کر سکتا ہے کہ ادیب کی حیثیت سے اس کی شخصیت اس کی سیاسی شخصیت کے پس پشت نہ پڑ جائے۔ اردو افسانہ کا المیہ یہ ہے کہ اس پر سیاسی مقصدیت اکثر و بیشتر غالب رہی ہے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد سے بعض ناقدین نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے تحت اردو افسانہ سیاسی تبلیغ کا ایک ذریعہ بن گیا تھا اور اس کی ادبی و فنی

مردہ سمندر میں پھینک دوں گی تاکہ عیسیٰ کی نشانیوں کے ساتھ تصویر بھی نکلے۔"

"بالزاک کے ناول کی بڑھیا بھی یہی کہتی ہے۔" وہ کش لگا کر دھواں چھوڑتا ہے۔

کامائنی اس قسم کا ذکر کرتی ہے جس میں دکھایا گیا تھا کہ کانٹوں کا تاج پہنانے کے بعد..... جب عیسیٰ کو صلیب پر لٹکایا گیا تو اس کے بعد اسکی سبھی نشانیاں جارڈن ندی میں بہادی گئیں جو بہتے بہتے مردہ سمندر میں جا پہنچیں۔

وہ کہتا ہے "میں دیکھ رہا ہوں پاگل خانے میں بڑھیا تالیاں بجا رہی ہے۔ بڈھوں کی حکومت کمزور پڑتی جا رہی ہے اور مردہ سمندر خشک ہو رہا ہے۔"

"مردہ سمندر کیسے خشک ہو سکتا ہے؟" کامائنی مسکراتی ہے۔

"کیا بڑھیا نے کچھ اور بھی کہا تھا؟" وہ پوچھتا ہے۔

"اس نے کہا تھا میری عمر سات اور اسی سال کی ہے اور تین سال بعد میں دس کم سو کی ہو جاؤں گی۔"

وہ بڑبڑاتا ہے "نیند میں بڑھیا مردہ سمندر کے کنارے گھومتی ہے اس انتظار میں کہ مردہ سمندر سوکھ جائے گا اور عیسیٰ کی نشانیوں کے ساتھ اس کی اپنی تصویر بھی نکلے گی جو اس نے سولہ سال کی عمر میں پھینکی تھی۔ اس کا پاگل پن تو دراصل اسی دن شروع ہو گیا تھا، جب اس نے اپنی تصویر مردہ سمندر میں پھینکی۔"

کامائنی کبھی تصویر کی طرف دیکھتی ہے کبھی کرزان کی طرف۔

"تم یہاں بیٹھو کرزان میں چلتا ہوں۔" میں کہتا ہوں۔

"مجھے تو خوشی ہو گی اگر کرزان یہیں رہ جائے۔" کامائنی مسکراتی ہے۔

"تم بھی یہیں رہ جاؤ نا" وہ کہتا ہے۔

"نہیں کرزان مجھے جانا ہوگا۔"

اُس کے کندھے پر لٹکتے ہوئے بال اور ٹھوڑی سے شروع ہونے والی لمبوتری داڑھی، نیلی آنکھیں اور ہاتھ میں چلم — یہ سب اُسے ایک فرشتے کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

وہ بات نہیں کرتا مسکراتا ہے۔

"آپ بھی رہ جائیے نا" کامائنی کہتی ہے۔

"میں تو اب چلوں گا" میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

کامائنی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکتی ہے "تھوڑا اور رکیے نا۔ کرزان کو لے جانا چاہیں تو بھی مجھے اعتراض نہیں، یہ رہنا چاہے تو یہ گھر اس کا ہے، ہاں تو مردہ سمندر سوکھ کیوں نہ جائے، اس میں سے میری یا بڑھیا کی تصویر نکلنے کی بات تو دور، عیسیٰ کی نشانیاں بھی ہرگز نہیں نکلیں گی، اور یہ تصویر ہے کہ جیتھڑے راستے کا بھید نہیں بتاتی۔"

صوفے سے اٹھ کر وہ تصویر کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر تصویر کی طرف پیٹھ کر کے کہتا ہے "ہوا یہ کہ اس رات صوفیہ نے گڑیا کو بتایا کہ تمہارا ڈیڈی آندرے دنیا کا سفر نہ کر سکا۔ وہ دنیا کے سفر کو مردہ سمندر کا سفر کہا کرتا تھا اور کبھی وہ کہتا تھا کہ ہمارا دماغ مردہ سمندر ہے جس میں نہ جانے کتنے لمحوں کی کتنی نشانیاں قائم رہتی ہیں" اور اسی رات میں نے صوفیہ کو بتائے بغیر مردہ سمندر کا سفر شروع کر دیا۔"

"میں کہتا ہوں: بالزاک کی نظر میں پیرس لالچ، سازش اور نفرت کا جنگل تھا تو ہماری نظر میں یہ شہر کیا ہے؟"

کزان کی نظریں کامائنی کے چہرے پر جمی رہتی ہیں، جیسے بغاوت اور پاگلپن کی سبھی آوازیں دب گئی ہوں۔

"میں چرسی بابا کی باتیں سننا چاہتا ہوں کزان!" میں کہتا ہوں۔

"چرسی بابا کون؟" کامائنی پوچھتی ہے۔

"جو بھیرو بنتے ہوئے گھاٹ کی پہلی سیڑھی پر گھنٹوں روتے رہتے ہیں"۔ میں کہتا ہوں۔

"مجبوری کا نام چرسی بابا"۔ وہ ہنستا ہے۔

"ہم سب بہروپئے ہیں"۔ میں کہتا ہوں۔

"تو کیا بالزاک بھی بہروپیا تھا جس نے پیرس کو لالچ، نفرت اور سازش کا جنگل کہا تھا؟ اٹ از آل ایبسرڈ"۔ وہ مسکراتا ہے۔

"لفظوں کے چہرے گھائل ہیں"۔ میں کہتا ہوں۔

وہ ہنس پڑتا ہے۔ کامائنی مسکراتی ہے، جیسے وہ ہم دونوں کا مذاق اڑا رہی ہو۔

کوئی سُنے یا نہ سُنے، ہم اپنی بات منانے پر بضد رہتے ہیں۔

"وہ جو پیرس میں مارا گیا، برف کے موسم میں کرسی خالی کر گیا۔ جس پر وہ اخبار کے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن کرسی خالی نہیں رہتی، اس پر کوئی اور آ بیٹھا"۔ میں کہتا ہوں۔

چلم چھوڑ کر وہ کہتا ہے: "مرنے سے پہلے آندرے نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا، برف پڑ رہی ہے، آج ۲۵ دسمبر ہے، کرسمس کی رات صوفیہ سے پہلی ملاقات کو آج نو سال ہوئے..... آج بھی اس کے ہونٹ اتنے ہی موٹے ہیں، جتنی میری ماں پاگل ہے، وہ گلی کے بچوں سے کہتی ہے، دیکھو بیٹا! تم میرے آندرے کے پیچھے مت چلنا، ورنہ تم بھی صوفیہ کی نیلی جھیلوں میں ڈوب جاؤ گے وہ میرے گالوں پر ہاتھ پھیر کر پوچھتی ہے بیٹا تمہیں صوفیہ کے ہاتھ اچھے لگتے ہیں یا میرے؟"

کامائنی اس تصویر کی بات کرتی ہے جو اس رات کوئی اس کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔

میں بھی بالزاک کے بڑھے ہوئے پیٹ والے بت کی تصویر دیکھتا ہوں میگزین کے پورے صفحے پر، اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ راہ چلتے کوئی اسمگلر میرے کان میں کہتا ہے، کیا یہ سونے کی گھڑی خریدو گے، ایسی امپورٹیڈ گھڑی ساری مارکیٹ میں نہیں ملے گی۔

کچن سے چینی کا برتن ٹوٹنے کی آواز آتی ہے اور کالی کافی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، وہی کٹ گلاس کے پیالے، وہی کالی کافی۔

بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ سرکار نے پچاس ہزار جھگیاں جلا دیں۔ جیسے شرارتی بچے پرندوں کے گھونسلے توڑ ڈالتے ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ فاختہ پر کیوں پھڑپھڑاتی ہے۔

کوئی نہیں جانتا مردہ سمندر کب خشک ہوگا۔

صاحب بی بی غلام، کے بوڑھے گھڑی بابو کی طرح میں قہقہہ لگا کر کہتا ہوں "سب بدل جائے گا۔"

"آج کل پیرس کچھ زیادہ تیز ہو رہا ہے۔ آج کا اخبار تو یہ کہتا ہے۔"
کامائنی مسکراتی ہے۔

"آندرے ہوتا تو پیرس کا رنگ دوسرا ہوتا۔"

"آندرے کون؟"

"وہی جو اپنی تصویر کسی کے کمرے میں چھوڑتا ہے۔"

اتنے میں آندھی آجاتی ہے۔ کامائنی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "آج تو آندھی کا رنگ کالا پیلا ہے۔ ہر سال ریگستان شہر پر حملہ کرتا ہے، لیکن الٹے قدموں پر واپس چلا جاتا ہے۔ ریگستان شہر کو کیسے دفن کر سکتا ہے؟"

"اور خون کا داغ بھی برف کے نیچے کیسے دب سکتا ہے؟" کزان بڑبڑاتا ہے "اٹ از آل ایبسرڈ۔ برف گر چکی ہے سب کچھ سفید ہو گیا، لیکن ایک جگہ خون نظر آتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس۔ یہ اسی کا خون ہے۔ اسے پولس اٹھا لے گئی۔ برف پھر پڑے گی اور خون کا داغ برف کے نیچے دب جائے گا۔ لیکن خون کا داغ۔ خون کا داغ برف کے نیچے کیسے دب سکتا ہے؟"

—— تحریک، دہلی

✤

جیلانی بانو | اسکوٹر والا

اکیلے گھر میں عابدہ کو ہر طرف پراسرار سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ منّے کو کاندھے سے لگائے ٹہلتے ہوئے وہ جانے کیا کیا سوچا کرتی تھی۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ سامنے دیوار پر بیٹھی ہوئی چڑیا بن جائے اور دیکھے کہ دوسرے گھر میں وائلن پر کون گیت گا رہا ہے۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اگر وہ منّے کی طرح ایک سال کی بچی بن کر پھر سے زندگی شروع کرے تو کیا بنے گی۔ اب وہ سسرال کا بھرا ہوا گھر چھوڑ کر پہلی بار الگ ہوئی تھی تو تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی۔ مگر اپنے میاں اور بچے کے ساتھ اپنا گھر بسانے کا جو چاؤ تھا وہ پورا ہوا۔ پھر جانے کیوں اسے یہ ڈر بھی لگتا تھا کہ اس کی جٹھانی کہیں جلن میں منّے کو زہر ہی نہ دیدے۔

نئے گھر میں ابھی تک کوئی نوکر نہ ملا تھا اور پھر منّا بھی اتنا چھوٹا تھا کہ وہ گھر کا کام کاج بالکل نہ کر سکتی تھی۔

یہی سب باتیں سوچتے سوچتے اس نے منّے کو سلا دیا۔

آج وہ بہت تھک گئی تھی۔ طویل بخار اور کھانسی کی وجہ سے منّا دن کو چین سے سوتا تھا نہ رات کو۔ محسن کو آفس جانے سے پہلے سنبھالنا پڑتا تھا

تب عابدہ ناشتہ تیار کر لیتی تھی۔ منّے کو سلانے کے بعد عابدہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنے سارے کاموں سے کیسے نپٹا جائے۔ کھانا بنانا تھا۔ منّے کے کپڑے دھونے تھے۔ گھر کی صفائی اور ــــ اور بھی جانے کیا کرنا تھا۔ باتھ روم میں جا کر اس نے بھیگے کپڑوں کا بیسن اٹھایا تھا کہ کھڑکی کے نیچے سے کوئی اسکوٹر والا شور مچاتا تیزی سے گزر گیا اور منا پھر آنکھیں کھول کر رونے لگا۔

"اونھ ــــ جانے کون منحوس تھا، سوتے بچّے کو جگا گیا" وہ پھر بچّے کو کاندھے سے لگا کے ٹہلنے لگی۔ اس کی ساس ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ اتنے چھوٹے بچّے کے ساتھ اکیلے گھر میں رہنا بڑا مشکل ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد منّے کو سلا کے وہ کچن میں بھاگی کہ پہلے کھانا تیار کر لے۔

ایک بجے تک بہت سے کام ہو چکے تھے۔ صرف عابدہ کو کھانا کھانا تھا کہ پھر ایک اسکوٹر شور مچاتا ہوا آیا۔ منّا اٹھ چکا تھا اور کچی نیند سے جگائے جانے پر سخت احتجاج کر رہا تھا۔ عابدہ کا جی چاہ رہا تھا کہیں سے اسے بھی ایک اسکوٹر مل جائے تو وہ اس اسکوٹر کا تعاقب کر کے خوب لڑے۔ بالکل فلمی ہیروؤں والی لڑائی۔ پوری سڑک چھوڑ کے کم بخت اس کھڑکی کے نیچے سے کیوں گزرتے ہیں۔ عجیب وضول محلہ ہے یہ۔ اس کی سسرال والا گھر بڑے پرسکون محلے میں ہے۔ منّا وہیں پیدا ہوا تھا اسی لئے ذرا سا بھی شور برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

مگر اس گھر کے ہر کمرے کی کھڑکی سڑک پر کھلتی تھی اور سڑک بھی اتنی پتلی سی تھی کہ سارے پھیری والے عابدہ کی کھڑکیوں میں منہ اڑا کے صدا لگاتے تھے۔

دو دن میں ہی عابدہ اس محلّے سے بہ خوبی واقف ہو چکی تھی۔ ٹھیک دس

بجتے ہی پھیری والے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سبزی والا ایک بجے آتا ہے۔ تین چار فقیر نو سے گیارہ تک آتے ہیں۔ لیکن ایک نہایت چیخنی بڑی آواز والا فقیر رات کو ٹھیک اس وقت آتا ہے جب منّا ہزار نخروں کے بعد سو جاتا۔

ادھر اسکوٹر والے نے الگ جان کھا لی تھی۔ صبح دس بجے جب منا سوتا تھا وہ جگا کے چلا جاتا۔ دوپہر میں ایک بجے جب عابدہ منے کو دودھ پلا کے خود بھی سونے کی کوشش کرتی تھی وہی اسکوٹر پھر دندناتا ہوا آجاتا تھا۔ اسکوٹر چلنے اور رکھنے کی آواز سے عابدہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے دو تین مکان آگے جا کے رک جاتا تھا۔ یعنی وہ عابدہ کا کوئی پڑوسی ہے جو بڑی پابندی سے اسے ستانے پہ تلا ہوا ہے۔ منّے کو دوبارہ سلاتے میں خواہ مخواہ اسکوٹر والا عابدہ کے دماغ پر سوار ہو جاتا تھا۔ بے چارہ اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھتا ہوگا جو یوں چیختا چلاتا ہوا آتا ہے۔ مگر ہے بڑا اندیدہ، ایک بجتے ہی آفس چھوڑ کر کھانے کے لئے بھاگا ہوا آتا ہے۔ جانے کون سا آفس ہے جو گھر جانے کی چھٹی مل جاتی ہے۔ یہاں تو منّا چاہے کتنا بیمار ہو مگر محسن وقت سے پہلے گھر نہیں آسکتے۔ اور وہ اسکوٹر والا نواب صاحب واپس ہوتے ہیں کبھی دو بجے کبھی ڈھائی بجے۔ ممکن ہے کھانے کے بعد قیلولہ بھی کرتے ہوں۔ شاید نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ جبھی بیوی کے دیدار کے لئے یوں طوفانی اسپیڈ سے بھاگے ہوئے آتے ہیں۔

شادی کے بعد شروع دنوں میں محسن بھی تو پانچ کی بجائے چار بجے ہی آجاتے تھے۔ لیکن منّا کیا ہوا کہ سارا رومانس ہی ختم ہو گیا۔ اب دن نکلے تو وہ

دونوں منے کی شرارتوں میں کھو جاتے۔ رات ہوتی تو منے کو سلانے جگانے کی مصروفیت ہوتی۔ صبح آفس جانے سے پہلے محسن کو تیاری میں کسی بات کا وقت ہی نہ ملتا۔ اس لئے عابدہ کی طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہ ملتا تھا اور وہ منے کو ٹاٹا کر کے گھر سے نکل جاتا تھا۔ مگر اسکوٹر والے کی بیوی اسے بار بار روکتی ہوگی کہ ابھی تو دو بجے ہیں ابھی سے آفس جا کر کیا کرو گے۔ البتہ چھٹی کے دن بڑا امن رہتا تھا۔ وہ کم بخت اسکوٹر والا نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر کیوں نکلنے لگا چھٹی کے دن۔ اللہ کرے کم بخت کے چھ سات بچے ہو جائیں۔ تب پتہ چلے اسکوٹر چلا کر شور مچانے کا۔

جانے کیوں وہ اسکوٹر والا دن رات عابدہ کے ذہن پر سوار رہنے لگا تھا۔ اسکوٹر والے کی ایک خوبصورت سی شوخ و شنگ دلہن عابدہ کی نظروں میں بس گئی تھی۔ گہرا گہرا میک اپ کئے، جھلملاتے ہوئے کپڑے پہنے، سرخ مچھر دانی کے اندر مسہری پر لیٹی رہتی ہوگی۔ ممکن ہے اب اس نے کھانا میز پر لگا دیا ہو، اس کا دولھا وقت کا پابند جو ٹھہرا۔ دوپہر ہوتی تو عابدہ کو نہ تو اب شام کا انتظار رہتا، جب محسن آفس سے آتا تھا نہ کھانا پکانے کا ہوش رہتا۔ اس کی نظریں بار بار گھڑی پر جاتی تھیں کہ کب ایک بجے اور اسکوٹر والے کی پھٹ پھٹ سنائی دے۔ جب تک وہ گزر نہ جاتا تھا عابدہ سخت مضطرب سی رہتی۔ جیسے بار بار چھینک آتے آتے رک جائے یا کوئی زوردار دھماکہ ہونے والا ہے۔ اور ہو نہیں پاتا۔ کتنی بار اس نے ارادہ کیا کہ اسکوٹر والے کو دیکھے۔ آخر وہ کون چھیل چھبیلا ہے۔ مگر اس کی کھڑکیاں

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

حیثیت بہت مجروح ہو چکی تھی۔ اس قول میں محض جذباتی صداقت ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بہت قبل ہی اردو افسانہ مقصدیت کا شکار ہو چکا تھا۔ پریم چند کے ہی افسانوں کو لیجئے۔ اُن کے بیشتر کردار گاندھی واد کے چوکھٹے میں جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان سے بھی پہلے مولوی نذیر احمد صاحب کے نام نہاد ناولوں (جنہیں سپاٹ افسانے کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا) میں مقصدیت ادبی و فنی قدروں پر غالب دکھائی دے گی۔ اسلئے مقصدیت کا الزام محض ترقی پسندوں کے سر تھوپنا صحیح نہ ہوگا۔ اس مقصدیت کی صورتیں ہر دور میں ضرور الگ الگ رہی ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ہمارے وہی افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں انسان اور اُس کی زندگی کو نظریہ سے بلند ہو کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بھی کوئی اتفاق نہیں ہے کہ بیدی کے بیشتر افسانے قدر اول کی چیز ہیں اور کرشن چندر کی بیشتر کہانیاں ادب کے دائرے سے خارج مانی جائیں گی۔

بعض دوسری اصناف ادب کی طرح مختصر افسانہ بھی اردو میں مغرب سے درآمد کیا گیا ہے۔ اردو کے بہت سے افسانہ نگاروں نے نہ صرف ہیئت اور تکنیک میں ہی مغربی تخلیقات کی پیروی کی ہے بلکہ اکثر خیال اور پلاٹ تک وہاں سے مستعار لئے ہیں۔ ایسے افسانوں میں خود سپاٹ، غیر متحرک اور بے جان کردار اور عمل کے فطری ارتقاء کی عدم موجودگی افسانہ نگار کی جسارت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔

مغربی افسانہ او۔ ہنری اور موپاساں تک آتے آتے بہت منجھ چکا تھا اور انسانی فطرت اور زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں اور باریکیوں کے اظہار کا وہ ایک موثر ذریعہ بن چکا تھا۔ لیکن تمام فنی چابکدستی کے باوجود واقعات کی ایک مخصوص مرتب کردہ تصویر

اتنی اونچی تھیں کہ جب تک پردہ ہٹا کر نہ دیکھو سڑک کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اب ایک غیر مرد کو دیکھنے کے لئے وہ کھڑکی کیسے کھول سکتی تھی۔ ایک آدھ بار اس نے محسن سے شکایت کی۔

"اس محلے میں ایک اسکوٹر والے نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ جہاں منّا سویا اور وہ کم بخت جگا گیا۔"

"کہیں بیٹھا دیکھتا ہوگا کہ تم منّے کو کب سلاتی ہو۔" محسن کی کسی پریشانی کو سنجیدگی سے نہ سنتا تھا۔

"آپ مذاق سمجھ رہے ہیں۔ مگر وہ سچ مچ روزانہ ٹھیک دس بجے جاتا ہے اور پھر ایک بجے کھانا کھانے کے لئے آتا ہے۔ پھر دو ڈھائی بجے جب منّا سو جائے تو جاتا ہے اور پھر رات میں ——"

"واہ بھئی اسکوٹر والے کی مصروفیت کے اوقات تو تمہیں خوب یاد ہو گئے ہیں۔ اب یہ کرو کہ اس کی پرائیویٹ سکریٹری بن جاؤ۔" محسن اپنے جوتے پر پالش کرنے میں خوب ہنسنے لگا۔

پھر اچانک عابدہ کو بھی احساس ہوا کہ ایک اَن دیکھے اجنبی کے بارے میں اس نے اتنی تفصیل کیوں یاد کر رکھی ہے۔

"آپ کو کیا معلوم اس کم بخت نے میری مصیبت میں جان کر دی ہے میرے بچے کی نیند کا دشمن ہو گیا ہے۔"

"تو کیا پولس میں رپورٹ لکھوا آؤں کہ ایک اسکوٹر والے نے اس کا اسکوٹر چھین لیا جائے کیوں کہ وہ ہمارے منّے کو جگا دیتا ہے۔"

"خیر آپ مذاق ہی کرتے رہیے۔ میں خود اس کا کوئی بندوبست کروں گی۔" عابدہ نے جھلا کر کہا۔

یہ محلہ بڑے گھٹیا لوگوں کا تھا۔ مردوں کے باہر جاتے ہی عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی ہو کر پڑوسنوں سے لڑنا شروع کر دیتی تھیں ایسے ایسے کوسنوں اور گالیوں کا آپس میں تبادلہ ہوتا تھا۔ جو عابدہ نے کبھی نہ سنی تھیں۔

اُس دن بھی وہ کسی کام سے کمرے میں آئی تو اس کی پڑوسن کسی سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں ہاں تو نے ہی میرے منّو کی ٹانگ توڑی ہے۔ کل تو نے کوسنے دیئے تھے کہ میری چھت پر چڑھنے والے کی ٹانگ ٹوٹے گی اور آج منو کی ٹانگ ٹوٹ گئی اب تو مجھے میں سولی پر چڑھا دوں گی۔ سور کی بچی۔"

عابدہ کو کوسنوں پر بالکل یقین نہ آتا تھا۔ مگر آج اس عورت کی بات سن کر سخت تعجب ہوا۔ کیا واقعی کوسنے اتنے خوف ناک ہوتے ہیں؟ جب ہی لوگ بددعاؤں سے اتنا ڈرتے ہیں۔ پھر اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اپنے کسی دشمن کو کوسنے دے کر دیکھے۔ اپنے دشمنوں کی لسٹ پر عابدہ نے نظر ڈالی تو سرفہرست اسکی جیٹھانی تھی۔ آدت کی پڑیا۔ سرخ مرچ۔ اس کی وجہ سے عابدہ کو الگ گھر لینا پڑا تھا۔ اور کالج میں ایک لڑکی شمیم اس کی جانی دشمن بن گئی تھی۔ مگر ان دونوں کو کوستے ہوئے عابدہ کا جی دکھا۔ جیٹھانی کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کم بخت ماں کے بغیر سسک سسک کر مر جائیں گے۔ اور رہا شمیم کا تو برا حشر ہوا۔ شوہر آوارہ

نکل گیا۔ بچے پیدا ہوتے ہیں مر جاتے ہیں۔ ایسے مرتے ہوؤں کو مارنے سے کیا فائدہ!

دوسرے دن محسن نے اپنے دوستوں کو رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ نئے گھر میں آنے کی خوشی میں وہ دعوت کھانے کو بے چین تھے۔ عابدہ بھی اپنے پکانے کے آرٹ سے ان سب کو متاثر کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے صبح ہی منّے کو دودھ پلا کے سلا دیا اور کچن میں بھاگی بارہ بجتے بجتے آدھا کام نپٹ چکا تھا۔ مگر ابھی شام کے لئے کچھ بھی نہ پکا تھا۔ اب تھوڑی دیر میں اسکوٹر والا آئے گا اور منّے کو جگا جائے گا۔ پھر شام تک وہ کچھ نہ کر سکے گی۔ اس لئے وہ پہلے ڈرائنگ روم کی صفائی کرنے پہنچی۔ ابھی جھاڑن ہاتھ میں لے ہی تھی کہ دور کہیں سے اسکوٹر کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور جانے کیوں خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ جلدی سے منّے کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مگر وہ کوئی اور اسکوٹر تھا۔ ادھر آنے کی بجائے کہیں اور چلا گیا۔

اب تو ایک بج رہا ہے۔ آج کیا بات ہوئی۔ اب اس سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا وہ بے چینی سے سارے گھر میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ منّا بڑے مزے میں دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے سو رہا تھا۔ عابدہ ٹہلتی ہوئی ورانڈے تک ہی آئی تھی کہ اسکوٹر کی آواز گونج اٹھی اور منّا کسمسا کے رونے لگا۔

"اللہ کرے مر جائے یہ اسکوٹر والا۔ کسی بس سے اس کا ایکسی ڈنٹ ہو جائے۔ اسکوٹر کے پرزے بکھر جائیں۔" جانے کیسے آج عابدہ کی زبان پر کوسنے آ گئے اور وہ منّے کو لے کر ٹہلنے لگی۔

شام کو محسن کے دوست آ گئے۔ شور مچاتے قہقہے لگاتے ہوئے۔ آٹھ بجے تک

گپ بازی ہوتی رہی۔ پھر کھانے کے تقاضے ہوئے۔ اتنی دیر میں شیام کچن میں جا کر ہر ڈش کا مزہ چکھ آیا تھا۔ اور اب کھانے کے لئے سخت بے قرار تھا۔ لیکن عابدہ چاہتی تھی کہ منا سو جائے تو کھانا میز پر لگائے۔

منا سو گیا تو دونوں میاں بیوی جلدی جلدی میز ٹھیک کرنے میں لگ گئے۔ عابدہ کام میں مصروف تھی مگر اس کے کان اسکوٹر والے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

کھانے کے دوران شیام، قیصر اور صادق نے مل کر خوب شور مچایا۔ عابدہ بھی بلا کی حاضر جواب تھی۔ مگر اسے یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ اسکوٹر والے کا وقت ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ میز سے اٹھی "میں ابھی ذرا منے کو دیکھ آؤں"۔

کمرے میں آ کر وہ سخت بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ بس اب پھٹ پھٹ کا شور ہونے والا ہے۔ اب منا اٹھ بیٹھے گا۔

کھانا ختم ہوا۔ کافی کا دور بھی پھیکا پڑ گیا۔ ہنستے ہنستے سب تھک چکے تھے۔ مگر کسی کا دل اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

آج شاید کچھ گھڑی آگے تھی۔ دس بج چکے تھے۔ پھر اسکوٹر والا کیوں نہیں آیا۔؟ عابدہ بار بار سوچ رہی تھی۔

"آج بھابی کا موڈ آف ہے" شیام نے پھر چھیڑ خانی کی۔

"نہیں تو" وہ ہنس پڑی۔ اور پھر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ واقعی کیا مجھے کوئی پریشانی ہے۔؟ بعض وقت دل میں ایسے اندیشے بھر جاتے ہیں کہ اپنی پریشانی کی وجہ خود سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار سوچنا پڑتا ہے کہ دل کیوں ڈوبا

جا رہا ہے۔ آج میں نے اسکوٹر والے کو کو سنے دیئے تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے یاد کیا اور آگے سوچنے کی بجائے گھڑی دیکھی ساڑھے دس بج چکے تھے۔

"بھابی بار بار گھڑی دیکھ رہی ہیں کہ اب خدا حافظ" قیصر نے شیام سے کہا۔

"مگر جب تک مرغ ہضم ہونے کی رسید نہ بھیج دے میں تو اٹھنے کے حق میں نہیں ہوں"۔

شیام آرام سے صوفے پر لیٹ گیا۔

"اللہ توبہ، میرے بار بار گھڑی دیکھنے سے یہ لوگ جانے کیا سمجھ رہے ہیں"۔ عابدہ نے شرمندہ ہو کر سوچا اور پوری دل جمعی سے ان کے ہنسی مذاق میں شریک ہو گئی۔

اچانک کہیں سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی اور عابدہ خوف کے مارے اچھل پڑی۔

"کیا ہوا ــــ؟ کیا بات ہے؟" شیام اور صادق کے علاوہ محسن نے بھی عابدہ کے ڈرنے پر ایک ساتھ پوچھا۔

"شاید محلے میں کوئی مر گیا ہے۔ اس کی بیوی رو رہی ہے"۔ عابدہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں جی ــ" محسن نے کھڑکی کے پاس جا کر غور سے آواز سن کر کہا۔

"کوئی عورت بچے کو مار رہی ہے، بڑے فضول قسم کے لوگوں کا محلہ ہے"۔

"فضول قسم کے لوگوں سے آپ کا مطلب ان خواتین سے ہے جو بچوں کو مارا کرتی ہیں"۔

شیام نے محسن سے پوچھا اور پھر شرارت بھری نظروں سے عابدہ کو دیکھ کر بولا۔

"ہم نے تو سنا ہے کہ بھابی بھی منے کو مارا کرتی ہیں۔"

"بلکہ منے کے باپ کو بھی۔" صادق نے کہا اور پھر سب ہنسنے لگے۔

مگر عابدہ بے حد پریشان سی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"کیا واقعی کوئی نہیں مرا۔ اسے ہے میں تو اتنا گھبرا گئی، میرا تو دم ہی نکل گیا تھا۔"

"مگر یہ تو بتائیے بھابی کہ اس محلے میں آپ کس کے مرنے کا انتظار کر رہی ہیں۔" صادق نے پوچھا تو پھر قہقہے بلند ہو گئے۔

مگر عابدہ نے ہنسنے کی بجائے سر جھکا لیا جیسے اسکوٹر والے کے مرنے کی پوری ذمہ داری اسی پر ہو۔

ہاسپٹل والوں نے لاوارث لاش سمجھ کر اسے مردہ گھر میں ڈال دیا ہوگا۔ اسکوٹر کے ٹکڑے سڑک پر بکھرے پڑے ہوں گے۔ اور اس کی بیوی بالوں میں پھولوں کا ہار سجائے، سولہ سنگار کئے، کھانا میز پر رکھے بیٹھی ہو گی، سوچ رہی ہو گی کہ آج جانے کس چڑیل نے اس کے شوہر کا راستہ روک لیا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ۔ کہ ۔ عابدہ ——

فضا کو یوں گم سم ہوتے دیکھ کر محسن کے دوست اٹھ کھڑے ہوئے۔

دس پندرہ منٹ کے بعد لائٹ آف کر کے محسن کمرے میں آیا تو عابدہ تکیہ پر سر رکھے رو رہی تھی۔

"عبو۔ عابدہ جان ۔ کیا ہوا ۔؟" وہ سخت پریشان ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ عابدہ کو اچانک کیا تکلیف ہو گئی۔ آخر بڑی دیر کے بعد وہ سسکیوں کو روک کر بول سکی۔

"محسن مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے کسی کی جان لی ہے۔"

"کیا ۔؟" محسن اچھل پڑا۔ اچانک اسے سارا کمرہ گھومتا نظر آیا۔

"تم نے کس کی جان لی ہے۔ کیا ہوا۔؟ مجھے پوری بات جلدی بتاؤ۔"

"وہ جو اسکوٹر والا روز کھڑکی کے نیچے سے جاتا تھا نا۔ میں نے آج اسے خوب کوسنے دئے تھے۔ اور آج وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ ضرور اس کی کسی بس سے ٹکر ہو گئی ہے۔ وہ مر گیا ہے جبھی تو اس کی بیوی رو رہی تھی۔"

"بس یہی بات تھی؟" محسن نے اسے تشویشناک نظروں سے دیکھا اور زبردستی اسے لپٹا کے تھپکنے لگا۔

"بے وقوف ۔ احمق کہیں کی ۔ تمہارے کوسنے نہ ہوئے بندوق کی گولیاں ہو گئے۔ چلو اب حماقت چھوڑ دو سو جاؤ۔ ہر وقت اسکوٹر والا، اسکوٹر والا۔"

مگر عابدہ ساری رات دہشتناک خواب دیکھتی رہی۔ کہتے ہیں قاتلوں کو کبھی ذہنی سکون نہیں ملتا۔ وہ بار بار خواب میں دیکھتی کہ کسی کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ پھر خوف کے مارے خود ہی چلانے لگتی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو جیسے مہینہ بھر کی بیمار ہو۔ تیز بخار میں اس کا بدن تپ رہا تھا۔ محسن سمجھ گیا کہ شاید اسی تیز بخار کی آمد تھی جو رات عابدہ جانے کیا اول فول

کب رہی تھی۔ آج محسن کو خود سارے کام نپٹانا پڑے اور آفس جانے سے پہلے اپنی امی کے ہاں جا کر فوری کسی ملازم کا بندوبست کرنے کو بھی کہنا پڑا۔

محسن آفس چلا گیا تو عابدہ بھی منّے کو لے کر سو گئی۔ مگر اچانک پڑوس میں کہیں رونے پیٹنے کا شور بلند ہوا۔ مختلف دردناک آوازوں سے عابدہ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کوئی مر گیا ہے ــــ وہ اٹھ بیٹھی ــــ خوف کے مارے کانپنے لگی اور پھر رو پڑی۔ منّے کو وہیں چھوڑ کر اس نے جلدی جلدی سارے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے بند کئے پھر باتھ روم میں جا کر اندر سے دروازہ یوں بند کیا جیسے اسے کوئی پکڑنے آ رہا ہو۔ تیز بخار اور ڈر کی وجہ سے وہ کانپ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب پولس اس کے دروازے پر آئے گی ــ قاتل یہ ہے۔ قاتل ــــ قاتل ــــ اس کی نظروں میں فلموں اور ناولوں کے ہزاروں قاتلوں کا چہرہ گھوم گیا۔ اور وہ زور زور سے چلّانے لگی ــ نہیں، نہیں ــــ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے کسی کا قتل نہیں کیا ہے۔ جب وہ چیختے چیختے تھک گئی تو باتھ روم کھول کر پھر اپنے کمرے میں آئی اور منّے سے لپٹ کر لیٹ گئی۔

لوگ کتنی زور زور سے رو رہے تھے۔ عورتوں کی آوازیں کیسی دردناک تھیں۔ ہائے اللہ اس کی بیوی کا جانے کیا حال ہوگا ــــ؟ اس کے جوڑے کے پھول ــــ مہندی لگے ہاتھ ــــ سرخ چوڑیاں ــــ اور پھر کہیں چپکے سے اس کے دماغ نے یہ بھی سوچا کہ اب وہ اسکوٹر کی آواز کے بغیر دن کیسے کاٹے گی)

وہ پھر رونے لگی اور اٹھ کر پھر ٹہلنے لگی۔

بھاگ جاؤ ــــ ٹہلتے میں اسے خیال آیا ــــ

ایسے موقع پر سب مجرم یہی کیا کرتے ہیں۔ مگر لوگ کہتے ہیں خون نہیں چھپتا۔ مرنے والے کی روح ہمیشہ قاتل کا پیچھا کرتی ہے۔ تو کیا وہ اسکوٹر والا اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا؟ محسن اب اس سے کتنی نفرت کرے گا۔ سسرال والے کیا کہیں گے؟ اور منّا ایک قاتل ماں کا بیٹا کہلائے گا۔ اور وہ ــــ وہ۔ خود اب عدالتوں میں کھنچی پھرے گی۔ حوالات میں بند ہوگی اور پھر ــــ پھانسی کا تختہ ــــ اس نے لرز کے سوچا اور پھر پلنگ پر گر پڑی ــــ رونے پیٹنے کا ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ غالباً موت کی خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔ وہ سب پوچھ رہے ہوں گے کہ کیسے مر گیا ــــ؟ کیا ہوا تھا ــــ؟ مگر کسی کو بھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ ایکسی ڈنٹ کی اصل وجہ کیا تھی۔ سب نے بس والے کو پکڑا ہوگا۔ تو پھر وہ کیوں ڈر کے مارے مری جا رہی ہے؟ اچانک یوں لگا جیسے اس کی پھانسی کی سزا معاف ہو چکی ہو۔

شاید بخار اب کم ہو چکا تھا اور وہ پسینے میں نہا رہی تھی۔

پھر اچانک دروازے کی بیل بج اٹھی ــــ اور عابدہ اچھل پڑی۔ ڈر کے مارے سارے گھر میں دوڑنے لگی۔

"دروازہ کھولئے ــــ" کوئی چلا رہا تھا۔

"یقیناً پولس ہوگی ــــ؟ اب اقرار کرنا ہی پڑے گا ــــ ہاں میں قاتل ہوں کہتے ہیں قتل کا اقرار کرنے سے سزا کم ہو جاتی ہے" دروازہ کھولتے میں اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ باہر ایک نوجوان مرد کھڑا تھا، ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں لئے۔

"معاف کیجئے محترمہ ــــ آپ کو بے وقت زحمت دی ہے۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں، صبح میرے خسر صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، میری بیوی بے ہوش ہے، کیا آپ دو تین گھنٹے کے لئے ہمارے بچے کو سنبھال سکیں گی ــــ اسے تھوڑا سا دودھ بھی پلا دیجئے۔ شکریہ ــــ"

عابدہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اس نے ہاتھ بڑھا کے بچے کو گود میں لے لیا۔

"مگر آپ کو کیا ہوا ہے ــــ؟ کیا آپ کے ہاں بھی کوئی ــــ؟"

اس آدمی نے غالباً عابدہ کے بکھرے ہوئے بال، آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ اور سرخ آنکھوں کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

مگر عابدہ نے جواب دینے کی بجائے کواڑ بند کر دیئے۔

پھر اچانک وہ اچھل پڑی ــــ کیونکہ باہر وہی مانوس کھٹ کھٹ سنائی دی اور خوشی کے مارے وہ اجنبی بچے سے لپٹ کر چلانے لگی۔

"نہیں ــــ میرا کوئی نہیں مرا، میرا کوئی نہیں مرا ــــ"

ــــ شبخون، الہ آباد

پیش کر کے قاری کو استعجاب میں ڈالنا اور داخلیت سے زیادہ خارجیت کا جلوہ دکھانا ہی ان افسانہ نگاروں کا وصف رہا ہے۔ اردو افسانہ نے اسی ہیئت اور تکنیک کو قبول کیا۔ مغرب میں یہ تکنیک اور ہیئت اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ شعور کی رو کی دریافت نے افسانہ کی ہیئت اور تکنیک سے متعلق بنیادی تصورات کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ لیکن اردو افسانے کے سانچے آج بھی بہت حد تک وہی ہیں جو او۔ ہنری، موپاساں، چیخوف وغیرہ کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم نفسیات نے انسانی ذہن اور فطرت کی جن بھول بھلیوں کو بے نقاب کیا یا مغرب میں افسانہ کی ہیئت اور تکنیک میں جو نمایاں تبدیلیاں آئیں اُن سے اردو افسانہ بالکل بیگانہ رہا۔ اردو افسانہ پر ان سب کا اثر پڑا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی ڈھانچہ آج بھی بڑی حد تک وہی ہے جو او۔ ہنری۔ موپاساں وغیرہ کے افسانوں کا رہا ہے۔ یہ صورت حال کچھ شاید غنیمت ہوتی اگر ہمارے بیشتر افسانہ نگار ان فنکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے جو موپاساں وغیرہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

فرائڈ اور مارکس کے اثر نے اردو افسانہ کو کچھ نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ جنسی مسائل، اور مزدوروں اور نچلے متوسط طبقہ کی زندگی کو افسانہ کا محور بنایا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو کے بیشتر افسانہ نگار متوسط طبقے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ اور مزدوروں کی زندگی سے ان کا براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلئے مزدور کی زندگی کے متعلق اُن کا تصور بے حد غیر حقیقی اور رومانی تھا۔ اس دور میں لکھے گئے بیشتر اچھے افسانے متوسط طبقے کی زندگی سے ہی تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے افسانہ نگار اسی طبقہ کی زندگی کا براہ راست تجربہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن ان افسانوں میں بھی

ادھوری تصویر

شردن کمار ورما

تصویر مکمل ہو گئی تھی۔

انل نے سگریٹ سلگایا اور ایزل سے ذرا فاصلے پر بھوری ملائم پتیوں پر لیٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح لیٹنا اچھا لگتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اندر و باہر بڑا سکون اور شانتی محسوس کرتا۔ اس نے اپنے اعضاء ڈھیلے چھوڑ دیئے اور آنکھیں موند لیں۔ پھر وہ سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، سامنے نیلی ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔

"ہیلو انل، سو گئے تھے؟"

وہ مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

"تم سوتے میں ہیمنگ وے کی کسی کہانی کے کردار کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ بھی کھلے میں اسی طرح بے فکری سے سو جاتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "I like it this way!"

انل سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ اسے لاجو یاد آ گئی۔ وہ جب بھی نیلی کے ساتھ

ہوتا اسے لاجو یاد آجاتی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی لڑکی، جس نے بس تک نہیں دیکھی تھی۔ لاجو کا خیال اس کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح آتا جیسے ہلکی ہلکی دُھند اسے چھو کر اُڑ رہی ہو۔ ایک نرمی اور خوشگوار ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہوتا۔ اس نے سگریٹ ختم کیا۔ اس دوران نیلی ایزل پر لگی تصویر دیکھتی رہی۔ اس کی پیٹھ انل کی طرف تھی۔ کھینی کھینی جینیز اور شرٹ میں ایسی لگ رہی تھی جیسے ایک ایک انگ الگ الگ پیچوں سے کسا گیا ہو۔

"یہ تمہارے لئے ہے۔"

"مجھے لینڈ سکیپ پسند نہیں۔" وہ پلٹ کر بولی۔ "یہ درخت، سلیٹ اور ٹین کی چھتیں، چمنیوں سے نکلتا دھواں، دور چوٹیوں پر چمکتی برف، جھرنے، آبشاریں، تو بیس سال سے دیکھتی آرہی ہوں۔ مجھے یہ سب بے معنی اور ٹھہرا ٹھہرا سا لگتا ہے۔ کوئی ایسی چیز بنا کر دو جسے دیکھ کر لہو رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگے۔"

انل نے اسے غور سے دیکھا اور سوچا۔ اس لڑکی کو اس کے تمام تر خیالات جذبات اور احساسات کے ساتھ کینوس پر اُبھارنے کے لئے کون سے رنگ درکار ہونگے اور لاجو کے لئے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وسیع، شفاف، نیلا۔

"تمہیں شکار کا شوق ہے؟"

"مجھے گھوڑوں سے واسطہ نہیں رہا ـــــ انل اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ وہ ٹھیلا لے کر اس پتھر تک گیا۔ جہاں سے سڑک دکھائی دیتی تھی اور نیچے اس کوٹھی کی ٹین کی ہری چھت بھی۔ جس میں وہ ان دنوں رہ رہا تھا۔ کوٹھی کے دُود کش سے دھواں نکل رہا تھا۔

"رام سنگھ نے کام شروع کر دیا ہے؟"

"ہاں!" نیلی اس کے قریب آ گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ اس کے جسم کی آنچ محسوس کر سکتا تھا۔ چست لباس میں ٹھاٹھیں مارتے جسم کو سن سکتا تھا۔ "میں اسے پانی گرم کرنے کے لئے کہہ آئی ہوں۔"

انل نے چمڑے کی جیکٹ پہنی اور رائفل اٹھا لیا۔ نخیلا نیلی نے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ نیلی نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ اور اپنا بوجھ تقریباً اس پر ڈال کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ انل اس کی گرم سانس کو اپنی گردن اور گالوں کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی ایک سہیلی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ جو اس کے بھائی کو چاہتی تھی۔ لیکن وہ کینیڈا چلا گیا جہاں اس نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی، اور جب وہ اداس رہنے لگی تو نیلی نے اسے سمجھایا کہ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، عورت کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کتنا کماتا ہے۔ آج کل اس کی وہ سہیلی ایک آئی اے ایس افسر کے چکر میں ہے۔ پھر وہ ایک لڑکے کے بارے میں بتانے لگی جو تھا تو تعلیمیافتہ لیکن جسے بندروں کی طرح درختوں پر چڑھنے، اچھل کود کرنے اور جنگلوں اور پہاڑیوں پر بھٹکنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ سخت وحشی تھا۔

انل سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا، خاموش چل رہا تھا۔ لاجو نے اسے اپنے بھائی کے بارے میں بتایا تھا جو صبح سے شام تک کھیت پر کام کرتا تھا، اس نے ایک دیوتا کا ذکر کیا تھا جو سامنے والے کالے پہاڑ کی چوٹی پر رہتا تھا اور ان کے گاؤں کو ہر مصیبت سے بچاتا تھا اور ان کی فصلوں اور ڈھور ڈنگروں کی رکھوالی

کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لاجو ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتی تھی اور ہنستی رہتی تھی۔

"اے۔" نیلی نے اس کی کلائی میں ناخن چبھویا۔ "اگر میں تم سے شادی کرلوں تو بار بار تمہیں یاد کرانا پڑے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔" وہ ہنسی۔ "مسٹر آرٹسٹ جب کسی لڑکی کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس طرح خود میں نہیں اتر جاتے۔ باہر نکل کر رہا کرو۔"

"سوری۔"

"آج تمہارا کیا پروگرام ہے، میرا مطلب ہے اگر آج تمہارا کوئی پروگرام یا APPOINT MENT ہو تو کینسل کر دو۔ آج ہم کہیں دور چلیں گے ذرا اڈونچر رہے گی۔"

"تم تھکی نہیں؟"

"میرے اندر کہیں جیسے پنکھے چل رہے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "میں ابھی تمہیں جس لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھی، سب سے پہلے اُسی نے تم سے میری ملاقات کرائی تھی۔ عجیب آدمی تھا۔ ایک دفعہ چوٹ لگی تو زخم پر کوئی دوا تک نہیں لگائی۔ سب نے اسے سمجھایا لیکن وہ بضد رہا کہ اسے ایسے ہی اچھا لگتا تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ چلا گیا ہے تو اکثر یاد آتا ہے۔ HE WAS ALIVE TO THE BONE پھر وہ سوچ کر بولی۔ "انل تم بھی تو کوئی بات کرو۔"

"تم کرو میں سن رہا ہوں۔"

"تم بڑے چالاک ہو۔ اس طرح تم میرے اندر تک جھانک لوگے اور تمہاری شخصیت مجھ سے چھپی رہے گی۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کسی لڑکی کے ساتھ تمہیں اتنا

CUNNING نہیں ہونا چاہئے۔"

"میں CUNNING نہیں ہوں۔"

"تم ہو۔ نہیں تو بولتے کیوں نہیں۔ ہر وقت مجھے ہی بولنا پڑتا ہے۔ مجھے اپنے بارے میں، اپنے سفروں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے لوگوں سے ان کے تجربات اور ایڈونچرز کی کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے۔"

"میرے تجربات میری تصویروں میں ڈھل جاتے ہیں۔"

"تم نے سارا ہندوستان گھوما ہے۔ مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں سے ملے ہو۔ اُن کے بارے میں کیوں نہیں بتاتے تم۔"

وہ خاموش رہا۔

"ڈیڈی کے ایک ریٹائرڈ کرنل دوست ہیں۔ وہ اکثر رات کو ہمارے ہاں آجاتے ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر وہ جب دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں سناتے ہیں تو مزہ آجاتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپاتے۔ کون سے ملک میں انہیں کس کس قسم کی عورتیں ملیں، کس مورچے پر کیا ہوا۔ ان کے پاس اتنے میڈل نہیں، جتنی مختلف دیسوں کی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ ڈیڈی شکار کے قصے سناتے ہیں۔ ڈیڈی نے شیر، چیتے، بھالو، جنگلی سور ہر جانور کا شکار کیا ہے۔ کئی بار زخمی ہوئے ہیں۔ آج کل وہ اور کرنل انکل پھر شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ ڈیڈی بڑے MATTER OF FACT قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں صرف دو چیزوں سے محبت ہے۔ اپنی بندوق اور شکار کئے جانوروں کی کھالوں سے۔ ممی رمی میں ڈوبی رہتی ہیں، کسی نہ کسی کو ڈھونڈ

لاتی ہیں. میں گھر میں ہوں تو مجھے پکڑ بیٹھتی ہیں. مجھے یہ ان ڈور لائف پسند نہیں. میرا جی چاہتا ہے افریقہ کے جنگلوں میں گھومتی پھروں، وسیع سمندروں میں دور دراز جزیرے تلاش کروں اور ان کے بارے میں لکھوں. کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ مجھے یہاں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ YOW KNOW I DID NOT CHOOSENT اچھا تم اپنے سفروں کے بارے میں لکھ کیوں نہیں ڈالتے. میرے دل میں اکثر ابال اٹھتا ہے، تب میں چاہتی ہوں کہ لکھتی چلی جاؤں. دو چار مرتبہ کوشش بھی کی. لیکن خیالات پنجرے میں بند چڑیوں کیطرح اڑنے اور چیخنے لگتے ہیں. تب مجھے سخت کوفت اور وحشت ہونے لگتی ہے. میں باہر کو دوڑتی ہوں. تم لکھو، میں تمہاری سب کتابیں خریدوں گی۔"

"میں تمہیں کتابیں PRESENT کروں گا۔"

"SO NICE OF YOU" وہ خوش ہو کر بولی: "تین چار سال ہوئے ایک مقامی شاعر نے مجھے اپنی کتاب دی. خلوص اور نیک خواہشات کے ساتھ۔" وہ ہنسی: "پڑھنے بیٹھی تو بور ہو گئی. کچھ بھی نیا نہیں تھا. وہی عشق میں مر جانے اور رقیر کے بولنے والے عاشق کے بیہودہ اور بے معنی جذبات. سب اگلی ہوئی باتیں. میں نے کتاب آتش دان میں پھینک دی اور راکھ لفافے میں ڈال کر ان حضرت کو بذریعہ رجسٹری واپس بھیج دی. میرا خیال ہے انہوں نے شاعری ترک کر دی ہو گی۔"

"تم خاصی خطرناک ہو۔"

"آرٹسٹ کو ہمیشہ نئی بات کہنا چاہیئے۔"

اب وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ انل نہانے چلا گیا اور وہ دھوپ میں بیٹھ کر ایک میگزین میں تصویریں دیکھنے لگی۔ لمبے اور اونچے درخت ادھر ادھر اوپر نیچے مکھری کوٹھیاں۔ چمنیوں سے اٹھتا دھواں۔ کسی کسی دریچے میں کوئی چہرہ دھوپ میں سوکھتے کپڑے اور سب سے پرے کالی پہاڑیوں کا سلسلہ۔ وہ بور ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ انل اتنی اتنی دیر اکیلا بیٹھا یہ سب کیسے دیکھتا رہتا ہے۔ ان واہیات چیزوں کو دیکھے جانے میں کیا تک ہے۔ کہتا ہے دور پہاڑیوں کو دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ کیا نامعقولیت ہے۔ کوئی پروگرام نہ ہو تو آدمی فلم ہی دیکھ آئے۔ وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

"اے انل جلدی کرو، میں بور ہو رہی ہوں۔"

"کچھ پڑھو، اندر ریک میں کتابیں رکھی ہیں۔"

"میں دن کے وقت نہیں پڑھ سکتی اور پھر مجھے تمہارا چیخوف اور پریم چند پسند نہیں۔ تمہارے پاس ہیمنگ وے یا زولا ہے؟"

"دل ناداں مجھے ہوا کیا ہے۔" وہ گانے لگا۔

"انل جب تمہاری آواز اچھی نہیں تو کیوں گاتے ہو۔"

"آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔"

"ٹھنڈا پانی۔" وہ تقریباً چیخی۔ "نکلتے ہو باہر کہ تمہاری چیزیں سڑک پہ پھینکوں۔"

انل جلدی سے باہر آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیلی کا ذہن اور ہاتھ ایک ساتھ کام کرنے لگتے ہیں۔ جتنی دیر وہ تیار ہوتا رہا۔ نیلی اس کے ساتھ رہی اور ہیمنگ وے

کے گن گاتی رہی۔

"ہمارے ہاں اس کی ٹکر کا کوئی بھی ادیب نہیں۔ دراصل کسی کو زندگی کا اتنا قریبی اور گہرا مشاہدہ اور تجربہ ہی نہیں۔ یہاں تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ترقی پسند کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرے تو اسے گالیاں اور مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ بے چارے عوام کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔"

رام سنگھ ناشتہ لے آیا اور وہ ادھر متوجہ ہو گئی۔ وہ بڑے گھریلو انداز میں بیٹھ کر انل کے لئے توس پر مکھن اور جیم لگانے لگی۔ پھر اس نے انل کے لئے انڈے چھیلے اور کوئی بنائی انل محویت کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ کھڑکی سے آتی دھوپ نیلی کے بالوں اور گردن سے لپٹ کر بے حد پیاری اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں دھوپ میں نیلی کے بدن کی حرارت تھی یا نیلی دھوپ کی ہلکی گرمی سے تپ رہی تھی، انل کو کمرے میں ایک نشہ اور آنچ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ میز پر جھکی پیالی میں چمچہ ہلا رہی تھی اور بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ خواہ مخواہ اس سے ڈرتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کا لباس دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے مٹر کی بھری بھری سی پھلی۔ اسے لاجو یاد آ گئی۔ وہ خاوند کے گھر جا کر اسی طرح کام کرتی رہیگی۔ روٹیاں پکا کر کھیت پر لے جائیگی اور کپڑے دھوئے گی۔ کچے فرش پر گوبر کی لپائی کرے گی۔ ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کرے گی اور پھر اپنا آپ اپنے خاوند کے حوالے کر کے یوں نشچنت ہو جائے گی۔ جیسے منزل پر پہنچ گئی ہو۔ وہ شاید کبھی بس نہیں دیکھے گی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ ڈیزل کا دھواں اور انجنوں کی گڑگڑاہٹ اسکی آتما

کی خانتی اور سکھ کو مجروح نہیں کر سکے گی۔ وہ سورج کے ساتھ جاگے گی اور اسی کے ساتھ سو جائے گی۔ اسے وہ شام یاد آ گئی جب وہ لاجو کے باپ کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچا تھا۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ سائے پھیل رہے تھے اور سامنے والا جنگل پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ لاجو اپنے گھر کے باہر بیٹھی رات کے کھانے کے لئے چٹنی پیس رہی تھی۔ سورج کی گلابی کرنیں لاجو اور سیب کے تنگوں پر پڑ رہی تھیں اور جب وہ اٹھی تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس لڑکی کی تصویر بنائے گا۔

"کوفی پیو۔" نیلی بولی۔

وہ خوابوں کے جزیرے سے نکل آیا اور کوفی سپ کرنے لگا۔ نیلی اس وقت خاموش تھی۔ انل کو یہ خاموشی بڑی عجیب اور پراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھی نیلی کا جسم کسی خوبصورت، مضبوط عمارت کے اس مینار کی طرح لگ رہا تھا۔ جو درختوں کے اوپر سے جھانک رہا ہو۔ انل کے دل میں بار بار آ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر نیلی کو اپنی بانہوں میں بھر لے۔ اس نے سوچا یہ جسم مرد کی قربت سے ناآشنا بھی نہیں ہو سکتا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

اُسے لگا جیسے وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہو۔ اس نے آنکھیں نیلی کے چہرے سے ہٹا لیں اور کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا بولا۔

"کچھ نہیں۔ چلو کہیں چلیں ۔" دراصل وہ جینز اور شرٹ میں بھری بارود سے ڈر گیا تھا۔

وہ باہر آگئے اور لان میں ٹہلنے لگے۔ جب وہ تین چکر لگا چکے تو نیلی نے رک کر کہا۔

" انل کوئی بات کرو، ورنہ میں اداس ہو جاؤں گی۔"

انل نے اس کی طرف دیکھا۔ اسکی خود سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔

" میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ایک لڑکی کی تصویر بنانا چاہتا ہوں، جو شملہ کی پہاڑیوں میں جھیل سے کچھ دور ایک گاؤں میں رہتی ہے۔"

" NUDE.."

" نہیں بھئی۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"نیلی" پیر ٹرک پر سے گزرتی ایک لڑکی نے نیلی کو آواز دے لی۔ وہ انل سے معافی مانگتی ہوئی ادھر چلی گئی۔ انل انہیں گیٹ پر کھڑے باتیں کرتا دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد وہ خوش خوش آگئی۔

" انل جانتے ہو یہ کون تھی۔ شملہ کی اے ون SKATER ہے آج رنک میں رونق ہوگی۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔"

رنک پہنچ کر نیلی SKATES باندھ کر فلور پر چلی گئی۔ انل ایک کونے میں بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ نیلی ایک نوجوان کا بازو تھامے رقص کر رہی تھی۔ وہ نہایت پھرتی اور خوبصورتی سے پہیوں پر گھوم گھوم جاتی۔ بار بار وہ نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خطرناک حد تک اس پر جھک جاتا۔ وہ ایک ٹانگ ہوا میں اچھال کر ایک پاؤں پر دور تک اس نوجوان کے ساتھ پھسلتی چلی جاتی

انل نے سگریٹ سلگا لیا اور سوچا اس سمے لاجو شاید باؤلی پر کپڑے دھو رہی

کردار ٹائپ کی حیثیت سے زیادہ آتے ہیں اور انفرادی خصوصیتوں کے حامل کم نظر آتے ہیں۔ پھر بھی بیدی نے اپنے افسانوں میں جیتے جاگتے کردار پیش کئے ہیں۔ ایسے کردار جو محض اپنے طبقہ کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کی غرض سے ہمارے سامنے نہیں آتے بلکہ اُن تمام پیچیدگیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں جو فطرت انسانی کا تقاضہ ہیں۔ یہ اردو افسانہ کی خوش قسمتی ہے کہ اسے بیدی جیسا فنکار نصیب ہوا۔ بیدی نے اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلہ میں بہت کم لکھا ہے۔ لیکن شاید ہی اُن کا کوئی ایسا افسانہ ہو جو اُن کی گہری فکر، دقت نگاہ اور حقیقت شناسی کی گواہی نہ دے سکے۔ اپنے ہمعصر افسانہ نگاروں میں درون بینی اور داخلی زندگی کی بوقلمونی کی مؤثر تصویر کشی کی جو قدرت بیدی میں ہے وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملے گی۔ کرداروں کی مناسبت سے فضا آفرینی کا گُر جتنا بیدی جانتے ہیں کوئی دوسرا افسانہ نگار نہیں جانتا۔ ساتھ ہی اُن کے سماجی پس منظر کو کبھی وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بیدی نے زندگی کو عمودیں دیکھا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھکر زندگی کی گہرائی کا جتنا احساس ہوتا ہے اتنا اُس کی وسعت کا نہیں۔ منٹو کے افسانوں میں زندگی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اور نیرنگیوں کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔ منٹو نے اردو افسانے کو جتنے مختلف النوع کردار دیئے ہیں شاید کسی افسانہ نگار نے نہیں دیئے۔ بیدی اور منٹو اردو افسانے کے دو مستحکم ستون رہے ہیں جنہوں نے زندگی کے براہ راست مشاہدوں اور تجربوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اور ساتھ ہی فنی قدروں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ انھوں نے مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کی خاطر کبھی اس سطح پر اُترنے کی کوشش نہیں کی جہاں کرشن چندر جیسے فنکار کو جھوٹی شہرت اور مقبولیت کی بھوک بالآخر

ہوگی اور تنہائی کے احساس سے بچنے کے لئے کوئی گیت گنگنا رہی ہوگی۔ اسے وہ سہانی صبح یاد آ گئی جب وہ سو کر اٹھا تھا۔ گھر کے تینوں افراد جاگ کر جا چکے تھے۔ اسے اپنے دیر سے جاگنے پر شرم کا احساس ہوا۔ وہ پچھلے برآمدے میں چلا گیا اور دن کے نرم اجالے کو گاؤں پر پھیلتے دیکھنے لگا۔ جس کمرے میں وہ سوئے تھے اس کے نیچے گایوں اور بکریوں کا باڑہ تھا اور وہاں سے لاجو کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید جانوروں کو چارہ ڈالتے ہوئے انہیں ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں اور اندازِ گفتگو سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب معصوم سی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چھپ کر لاجو کو ڈھور ڈنگروں سے باتیں کرتے دیکھے کہ ایسے میں وہ کیسی لگتی ہے۔ وہ ایک بچھڑے کو رسی سے کھینچتی ہوئی باہر آ گئی اور انل کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ بچھڑا اندر بھاگ گیا۔

انل بے ساختہ ہنس دیا۔

وہ بھی ہنس دی اور جا کر بچھڑے کو کھینچ لائی۔

"بابو جی چاء بنا دوں؟"

"نہیں لاجو، یہ پھر بھاگ جائے گا۔" اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اس کا کیا اثر لیتی ہے۔ لیکن وہ بچھڑے سے کھینچا تانی کر رہی تھی۔ اس نے رسی ایک درخت سے باندھ دی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میری بڑی بہن اس طرح کھینچ کھانچ کر مجھے سکول بھیجا کرتی تھی۔"

"بابو جی، تم نے چودہ جماعتیں پاس کی ہیں؟"

"سولہ۔"

"ہمارے گاؤں میں کوئی سکول نہیں۔" پھر وہ جیسے کچھ سوچ کر بولی۔ "نہانے کے لئے پانی گرم کردوں؟"

"نہیں، میں نیچے کھڈ پر نہاؤں گا۔"

"بابو اور دیر بھی وہیں نہاتے ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن دور ہے۔ وہاں۔" اس نے نیچے اشارہ کیا اور 'وہاں' کو قدرے لمبا کر دیا۔ "درختوں کے پیچھے۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں، کپڑے دھونے۔"

"بڑا کام کرتی ہو تم۔"

"تم نہیں کرتے؟"

"میں بھی چلتا ہوں، سامان لے آؤں۔"

وہ نہانے کا سامان تھیلے میں ڈال کر باہر آ گیا۔ لاجو نے گائیں اور بکریاں باہر نکال دی تھیں اور اب وہ نیچے جانے کے لئے تیار تھیں۔ اسے دیکھ کر لاجو اندر گئی اور میلے کپڑوں کی گٹھڑی سر پر اٹھائے آ گئی۔

"چلو۔" اس نے جانور نیچے جانے والی پگڈنڈی پر ہانک دیئے۔ ان کے پیچھے خود اترنے لگی۔

"تالا نہیں لگاؤ گی۔؟"

"یہاں چوری نہیں ہوتی۔ دیوتا سب کی آتما میں رہتا ہے۔"

انل کو جانے کیوں جرم کا سا احساس ہوا، رات وہ بستر پر لیٹا دیر تک اس کونے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ جہاں لاجو فرش پر سو رہی تھی۔ لالٹین کی ہلکی

سی روشنی میں لاجو کا چہرہ نیند میں اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ انل کو اپنے اندر کسی بھوکے بھیڑیئے کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں وہ دیوار کی طرف منہ کر کے سونے کی کوشش میں دیر تک جاگتا رہا تھا۔ لالٹین بجھانے کے بعد دیر تک اس بھیڑیئے سے اندھیرے میں لڑتا رہا تھا۔

"اے انل کہاں ہو؟"

وہ چونکا۔ نیلی ریلنگ پر جھکی مسکرا رہی تھی۔

"بھئی کمال کے آدمی ہو، جھٹ کھو جاتے ہو۔ میں شملہ کے ٹاپ SKATER کے ساتھ فلور پر تھی۔ تم نے دیکھا؟ وہ بے حد ENCOURAGING ہے۔"

"ہاں۔"

"ANIL DONT YOU FEEL JEALOUS"

"بالکل نہیں۔"

"BUT YOU SHOULD" وہ کھل کر ہنسی پھر بولی "ایک راؤنڈ کے بعد ہم چلیں گے۔ YOU WONT MIND ہیں؟"

انل نے سگریٹ سلگایا اور سوچا۔ نیلی مرد سے سب کچھ چاہتی ہے اس کی تمام تر توجہ اور بدلے میں وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ وہ ایک لمحہ بھی نہیں۔ جس میں وہ یہ محسوس کر سکے کہ اُسے نیلی یہ لڑکی، مکمل طور پر مل گئی ہے۔ نیلی حد درجہ کی خود غرض ہے۔ اور لاجو ان لڑکیوں میں سے ہے جو قربانی کو عین عبادت سمجھتی ہیں جو اپنا سب کچھ ارپن کر دینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اسی میں اپنی جیت سمجھتی ہیں اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتیں، کچھ نہیں مانگتیں اور دونوں

ہی لڑکیاں ہیں۔ اسی دھرتی کی عورتیں۔

نیلی اس نوجوان کی بانہوں میں جھول رہی تھی اور وہ لاجو کو سامنے لئے بیٹھا تھا۔ لاجو بڑی سادگی اور معصومیت سے ہنس رہی تھی اور اپنی کالی بکری کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ان دنوں کی بات کر رہی تھی جب بادل کئی دن مسلسل برستے رہے تھے۔ دیوتا ان سے ناراض ہو گیا تھا۔ ان سے نہیں گاؤں کی ایک کنواری سے جو ایک ڈرائیور کے ساتھ گاؤں سے چلی گئی تھی اور اس کا منگیتر سامنے والے پہاڑ پر دیوتا کے پاس شکایت لے کر گیا تھا وہ تو واپس نہیں آیا، لیکن گاؤں میں جل تھل ہو گیا تھا۔

لاجو گایوں، بکریوں کو راستے پر رہنے کی تلقین کرتی چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ انل سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ وہ انل کو بتا رہی تھی کہ براس کے پھولوں کی چٹنی بہت لذیذ ہوتی ہے۔ اور کہ رات کے کھانے پر وہ اس کے لئے یہ چٹنی تیار کرے گی۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ کس طرح پچھلے سال بکری کا بچہ مرنے پر وہ کئی دن تک اداس رہی تھی۔

اس طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے وہ کھڈ پر پہنچ گئے۔ تازہ شفاف پانی پتھروں میں بہہ رہا تھا اور صبح کی ہلکی ہلکی دھوپ میں پتھر ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ لاجو نے کپڑوں کی گٹھڑی ایک طرف رکھ دی اور ایک چوڑے سے پتھر پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ انل نے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں پتھروں پر چلتا ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں وہ اطمینان سے نہا سکے۔

"بابو جی آگے نہ جانا دھارا تیز ہے۔"

انل نے پلٹ کر لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ اس بڑے اونچے پتھر پر کھڑی کوئی آسمانی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ بکریاں اور گائیں ادھر ادھر ڈھلوانوں پر چڑھ گئی تھیں۔ دونوں طرف پہاڑیاں تھیں۔ اور اوپر نیلا وسیع آسمان اور خاموشی۔

"لاجو تم روز یہاں اکیلی آتی ہو؟"

"یہ سب جو میرے ساتھ ہوتی ہیں؟" اس نے گایوں، بکریوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ڈر نہیں لگتا؟"

وہ ہنس دی۔

"تم ڈرتے ہو۔؟"

وہ بھی مسکرا دیا اور ذرا فاصلے پر ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چلا گیا۔ اب وہ نہانے کے لئے تیار تھا۔ اپنے کپڑے ایک طرف رکھ کر وہ پانی میں اتر گیا۔ لاجو اب کپڑے دھونے لگی تھی۔ وہ پانی میں چلتا ہوا لاجو کے قریب پہنچ گیا۔ اور پانی میں بیٹھ کر اسے شہروں کے بارے میں بتانے لگا۔ لاجو کو معلوم نہیں تھا کہ شہر کیسے ہوتے ہیں وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہاں کے آدمی کیسے ہوتے ہیں۔ نہ اسے دیت نام کے بارے میں پتہ تھا اور نہ وہ یہ جانتی تھی کہ کلکتہ اور چنڈی گڑھ میں کیا ہوا ہے۔ وہ بہت سکھی تھی۔

پھر نیلی آگئی اور لکڑی کے فرش پر لوہے کے پہیوں کی آواز اور ہاں کا شور اور فلمی ریکارڈ۔ وہ دونوں باہر آگئے۔ سڑک پر اخبار بیچنے والے پکار پکار کر مدراس سرکار کے نئے حکم کا اعلان کر رہے تھے۔ وہاں ہندی بالکل ختم کر دی گئی تھی۔

گاڑیوں کو آگ لگادی گئی تھی اور بمبئی میں شوسینا جوابی کارروائی پر اتر آئی تھی اور نیلی اسے SKATING کے مقابلوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور ان انعامات کا ذکر کر رہی تھی جو اس نے حاصل کئے تھے اور ان فلمی ایکٹروں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ جن کے ساتھ اس نے شملہ میں فوٹو کھنچوائے تھے۔ پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

"انل تم لاجو کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"وہ بے حد معصوم تھی۔"

"پھر" اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

انل خاموش رہا۔ وہ ایک ویران راستے پر نیچے اتر رہے تھے اور ان کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا جو رات کی طرح گہرا اور خاموش تھا۔ وہ اسے بتانے لگا کہ کیسے جنرل الیکشن کے دوران وہ اپنی پارٹی کی طرف سے کام کرنے کنڈا گھاٹ گیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات لاجو کے باپ سے ہوئی تھی۔ وہ انل کو اپنے گاؤں لے گیا۔ پھر اس نے نیلی کو لاجو کے باپ بھائیوں، ماں اور گایوں، بکریوں کے بارے میں بتایا اور اس دیوتا کے بارے میں بھی جو گاؤں کی کنواریوں اور کھیتوں کی رکھشا کرتا تھا۔

"مجھے لاجو، ایک جھرنا، سیب کا ایک پیڑ لگی تھی۔" انل نے درختوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے باتیں کر کے اس کے پاس بیٹھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی مندر میں آ بیٹھا ہوں۔"

"تم آرٹسٹوں سے خدا بچائے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "عورت تمہیں عورت ہی نہیں اور سب کچھ معلوم ہوتی ہے۔"

"وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔" اس نے خلوص سے کہا۔

"میں ایسی ویسی کی بات نہیں کہہ رہی۔ لڑکی تھی کہ نہیں۔" وہ مسکرائی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ "خیر تم اس کے ساتھ سیر کرنے گئے۔"

انل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"لاجو تمہاری ہر بات پر کھل کھلا کر ہنستی تھی، ہیں نا۔" نیلی نے کہا۔ "تم نے اس کی تصویریں لیں اسے پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے میں مدد دیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما لیا۔ اس کے جوڑے میں پھول لگائے اسے سینما، نمائش اور ہوٹلوں کے بارے میں بتایا۔" وہ ہنسی۔ "دیکھو میں نے تمہیں دیکھا نہیں پھر بھی میں سب جانتی ہوں میں کیوں سے یہ کہانیاں سن چکی ہوں۔"

"میں نے کہا نا وہ بہت بھولی بھالی اور سیدھی سی لڑکی تھی۔"

"وہ دیکھو گرگٹ۔" وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "گرگٹ کئی رنگ بدلتا ہے۔"

اب وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے۔ جہاں پانی کئی شاخوں میں بٹ کر بہہ رہا تھا اور آس پاس اونچے، گھنے درخت تھے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ نیلی جیسے اس مقام کے چپے چپے سے واقف تھی۔ وہ انل کا ہاتھ پکڑ کر ایک درخت کے جھنڈ میں لے گئی۔ وہاں خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں پڑی تھیں۔ اخبار کے کاغذ اور لفافے بکھرے تھے اور قریب پانی گنگناتا بہہ رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ انل نے جیکٹ اتار دی اور سگریٹ سلگا کر لیٹ گیا۔ لیکن وہاں سے آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قید کر دیا گیا ہو۔

"یہاں تو گھٹن کا سا احساس ہوتا ہے۔"

نیلی نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ انل نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے لگا نیلی کا لباس چرچرا کر پھٹ جائے گا۔ وہ اٹھنے لگا تو نیلی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"لاجو خوبصورت تھی؟"

وہ چپ رہا۔

"تم نہاتے رہے اور وہ کپڑے دھوتی رہی۔"

"ہوں؟"

"پھر تم اس کے قریب جا بیٹھے؟"

"ہاں۔" وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا اور نیلی اس کی چھاتی کو ہولے ہولے سہلا رہی تھی اور اس نے اپنا سر انل کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

"اور تم باتیں کرتے رہے؟"

"ہاں۔"

"بس۔"

وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور نیلی کی طرف دیکھا۔ نیلی کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں یقین نہیں آرہا؟"

"تم آخری بات چھپا رہے ہو۔" وہ لیٹے لیٹے بولی۔ "میں نے بہت سی ناولیں پڑھی ہیں، فلمیں دیکھی ہیں۔ تم جو چھپا رہے ہو، میں پہلے سے جانتی ہوں۔" وہ ہنس دی۔ "لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ میں ان لڑکیوں

میں سے نہیں ہوں۔ جو اس بات سے منہ کھلا لیتی ہیں" میں جانتی ہوں مرد ــــ

وہ کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ جلدی سے جھنڈ میں سے باہر نکل آیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ آسمان اب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اوپر جانے والے راستے پر ہو لیا۔

ــــ اوراق، لاہور

❖

عجائب سنگھ

الیاس احمد گدی

عجائب سنگھ پشت کی چھوٹی کھڑکی میں اپنا چوڑا چہرہ گھسا کر دھاڑا۔
" اب چپ بھی کرو گی تان سین کی بیٹیو یا نہیں۔ گیر پھنس گیا ہے"۔
پیچھے ڈالے میں بیٹھی ہوئی چوڑے شانے والی آدی باسی لڑکیاں بدستور گاتی رہیں۔

" کون کسور دیا، بچھڑل مور پیا، ہائے رے ہائے
چھاڑ ئے رکھل دور دیے ...."

(اے سکھی پتہ نہیں کس خطا پر میرا محبوب مجھ سے بچھڑ گیا ہے اور مجھے اتنی دور چھوڑ دیا ہے۔)

ان کی تیز، جوان، تن درست اور سریلی آواز برداگ کے گھنے جنگلوں اور پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی میں دور دور تک لہرا رہی تھی۔ موسیقی کا رس چاروں طرف رچ گیا تھا ـــــ عجائب سنگھ نے دو چار جھٹکے گیئر کو دیئے مگر گیئر محض کڑکڑا کے رہ گیا۔ جھلا کر اس نے اپنی میلی ہتھیلی سے اپنی پیشانی کا پسینہ پوچھا اور علی سے بولا۔

لے جانے میں کامیاب ہوگئی۔ کرشن چندر نے اپنے ابتدائی دور میں بہت اچھے رومانی افسانے لکھے تھے۔ ان افسانوں میں اگرچہ کوئی گہری بصیرت کی جھلک نہیں تھی لیکن وہ کرشن چندر کے ایک خوش آئند مستقبل کے خمازہ ضرور تھے۔ "گرجن کی ایک شام"، "اور ان داتا" کا مصنف "ہم وحشی ہیں" تک پہونچتے پہونچتے اپنے فن کو اپنے ہاتھوں دفن کر چکا تھا۔ "ہم وحشی ہیں" کو محض اس وجہ سے بلند پایہ تخلیق قرار دینا کہ ان میں فسادات کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے اور ان میں کرشن چندر کی انسان دوستی کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا ہے ہمارے ناقدین کا دیوالیہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ انسان دوستی بلاشبہہ ایک قابل قدر جذبہ ہے۔ لیکن کوئی افسانہ محض اس بنا پر اچھا افسانہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس میں افسانہ نگار نے انسان دوستی کے موضوع پر کوئی تقریر لکھدی ہے۔ اس کے برعکس منٹو نے جو افسانے فسادات کے متعلق لکھے وہ انسانی زندگی کی کہیں زیادہ حقیقی اور اثر انگیز تصویر پیش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اُن میں انسان دوستی کا جذبہ کہیں زیادہ توانائی اور تاثر کے ساتھ اُبھرا ہے۔

جن دوسرے افسانہ نگاروں نے اردو کو کامیاب افسانے دیئے اُن میں عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ عصمت چغتائی کے بیشتر افسانوں میں چونکا دینے کا عنصر ہی غالب رہا ہے، تاہم انہوں نے اپنے کرداروں خصوصاً نسوانی کرداروں کی داخلی زندگی کے کئی ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو اس سے پہلے پوشیدہ تھے۔ اُن کے افسانوں کے موضوعات بہت محدود تھے۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہی جب اُن کے تجربات کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر بھی اُن کی اہمیت اس لحاظ سے بہت ہے۔ کہ متوسط طبقے کی جنسی زندگی پر انھوں نے بہت جسارت سے

"علی! ان حرام زادیوں سے پوچھو، کیا سارے چھوٹا ناگ پور کی مستی انھیں پر چڑھی ہے۔؟"

علی ہنسنے لگا۔

"مگر یہ تو بروگ کا گیت ہے استاد، جدائی کا.....!"

"میں کہتا ہوں، جدائی کے بچے! رِنچ نکال، کھوپڑی کھولنی ہوگی۔" وہ ہمیشہ گیئر کور (GEAR COVER) کو کھوپڑی کہا کرتا تھا۔

لڑکیاں ابھی تک لہک لہک کر گا رہی تھیں:

گھر آنگن سون پنجر ہمیں لاگے گھونّ
پیا بن اکیو موکے لاگے نہیں بیسے
چھاڑے رکھل دور دیسے.....

(گھر آنگن سونا ہے اور جسم کو گھن لگ رہا ہے اور محبوب کے بغیر مجھ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔)

گیئر کے نٹ میں رنچ پھنسا کر وہ علی سے بولنے لگا۔

"کسی دن سالیوں کو لئے دیئے سنتاؤں کی گھاٹی سے نیچے اتر جاؤں گا۔"

اس نے نٹ گھمانے کے لئے زور لگایا تو رنچ پھسل گیا۔

جب ہی اچانک لڑکیوں نے گیت بند کر دیا۔ فضا پر جو سرور چھایا ہوا تھا اور خاموش جنگل کے پراسرار سناٹے میں جو افسوں رقصاں تھا شکست ہو گیا لڑکیوں نے جھانک کر دونوں مردوں کو گیئر بکس پر جھکے دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے وہ نیچے کود آئیں، ایک لڑکی نے ڈریونگ گیٹ کھولا

اور پنجابی میں بولی۔

"کی ہویا سی؟"

عجائب سنگھ نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔ یہ چوڑے شانے اور بھرے بھرے بدن والی سونا تھی۔ ایک شریر، خوبصورت، بے ریا مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ تنی ہوئی تھی۔ شرارت اور شباب کے رنگ سے اس کا سانولا چہرہ منور تھا اور جوان اور گہری سیاہ آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

"تو جو پھٹ پھٹ بولتی ہے تو اگر کہیں کوئی پنجابی تجھے اٹھا لے گیا تو تیری ماسی ساری بستی میں چھاتی پیٹتی پھرے گی، سمجھی...!"

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ سونا ایک دم شرما کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ پھر سڑک سے نیچے اتر کر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور اپنی خجالت مٹانے کے لئے ہاتھ گھما کر زور سے پتھر سامنے کھڑے ہوئے جامن کے تناور درخت پہ پھینک دیا۔ سیاہ رس بھری جامنیں ادھر ادھر بکھر گئیں، ان گرتی ہوئی جامنوں کو دیکھ کر دوسری لڑکیاں بھی دوڑ پڑیں۔

سہ پہر کے ڈھلتے ہوئے سورج نے چاروں لڑکیوں پر، تمام چیزوں پہ زرد، سنہرا ملمع چڑھا دیا تھا۔ بردا داگ کے جنگل کی خاموش فضا میں عجائب سنگھ کی ہتھوڑی کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ سارا جنگل خاموش کھڑا تھا۔ لمبے اونچے درخت ہوا کے کسی تیز جھونکے سے لپٹ جاتے تو پتیوں کی سنسنی کی آواز سنائی دے جاتی۔ لڑکیاں بار بار پتھر پھینک کر جامنیں توڑنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے پھینکے ہوئے ہر پتھر کے ساتھ کچھ جامنیں بکھر جاتیں

جب کوئی سالم گچھا ٹوٹ کر گرتا تو لڑکیاں خوشی سے تالیاں بجانے لگتیں. عجائب سنگھ ان لڑکیوں کی خوش فعلیوں پر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا ہوا گاڑی بنانے میں مصروف رہا۔

گاڑی جب دوبارہ ٹھیک ہوئی تو لڑکیوں نے اپنے انگوچھے سیاہ جامنوں سے بھر لئے تھے اور اب جگالی میں مصروف تھیں۔ ان کے بھرے بھرے موٹے گداز ہونٹ ان جامنوں کے رنگ میں ڈوب کر خوں آشام ہو گئے تھے. عجائب سنگھ نے گاڑی اسٹارٹ کرکے، لوکنگ گلاس میں اپنا چہرہ دیکھا۔ موٹا بھرا ہوا چہرہ، زمانے نے جس پر خراشیں ڈال دی تھیں! آنکھوں کی تابانی ماند پڑ چکی تھی۔ اور صافے کے گوشوں سے جھانکتے ہوئے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی. مگر ان تمام باتوں کے باوجود ایک نوعمر کھلنڈرا پن ایک پر رونق بشاشت اس کے چہرے پر حاوی تھی۔ اور اس کے بڑھاپے کی تردید کرتی تھی..... وہ مسکرایا ـــــ منشی سالا جھوٹ موٹ کہتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

علی اس کے پہلو میں جیپ جاپ گیئر کا ڈنڈا پکڑے بیٹھا تھا۔ ٹب پنین سلپ کر گیا تھا۔ اس لئے علی کو ہمیشہ گیئر کا راڈ پکڑ کے رکھنا پڑتا تھا۔ پیچھے ڈالے میں لڑکیاں خاموشی سے جامن کھانے میں مصروف تھیں. عجائب سنگھ کو یہ خاموشی بری لگی۔ اس نے علی سے کہا۔

"علی، ان سے کہو کہ گائیں.....!"

علی نے لپشت کی کھڑکی کی طرف چہرہ گھما کر جیسے حکم دیا۔

"اے سونا، تم لوگوں نے گیت کیوں بند کر دیا؟ کچھ گاؤ۔"

سونا نے جامن کا بیج زور سے تھوک دیا اور لہک کر گانے لگی۔

"تو رلیکھے رہے بابو ہمرو پر وکھ ہو، تو رلیکھے.....

کہ پلنگا کے اوپر بچو کرت دلار....."

لڑکیاں ہنسیں تو علی نے کھڑکی کی طرف منہ کر کے جواب دیا۔

"تو رلیکھے رہے میاں ہمرو گھر کے گھرنی گے.... تو رلیکھے.....

باسی کھاتے کی گے میاں بینکا ڈولائے....."

لڑکیوں میں زبردست کھٹپا کا پڑا۔ علی بھی ہنسنے لگا اور پھر عجائب سنگھ کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتے دیکھ کر اسے گیت کا مطلب سمجھانے لگا۔

"(سونا نے کہا کہ اے بابو تمہاری طرح میرا بھی چاہنے والا تھا، جو مجھے پلنگ کے اوپر بیٹھا کے پیار کرتا تھا۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ اے لڑکی تمہاری طرح میری بھی گھر والی تھی جو مجھ سے اتنا پیار کرتی تھی کہ باسی اور ٹھنڈے کھانے پر پنکھا جھلتی تھی۔)"

عجائب سنگھ نے بائیں ہاتھ سے علی کی جانگھ پر تھپڑ مارا۔

"ابے، تو نے کہاں سیکھی یہ مسخری؟ تو تو دیکھنے میں بڑا سیدھا لگتا ہے۔"

علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جونا کی چڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ عجائب سنگھ نے گاڑی کو اسپیشل گیئر میں ڈال دیا۔ بوڑھا انجن ہائیں ہائیں کرنے لگا علی نے اس شور سے گھبرا کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔

سڑک کے پہلو میں ایک برساتی نالا گدلے مٹیالے پانی کا بوجھ اٹھائے

تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس گدلے پانی میں سر اٹھائے اکا دکا سیاہ چٹانیں یوں دکھلائی دے رہی تھیں جیسے کوئی بھیل عورت اپنے سیاہ فام بچّوں کو چھاتی سے چمٹا کے سو گئی ہو۔ ٹرک موڑ پر موڑ گھوم رہی تھی، گہری اندھیری کھائیاں جیسے اس ٹرک کو نگلنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ لیکن ہر موڑ گھوم کر ٹرک جیسے ان کھائیوں کو جل دے جاتی اور اس کے پہلو میں نیچے اسی گدلے پانی والے نالے کی مخنی سی لکیر دکھلائی دے جاتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سڑک، ٹرک اور وہ نالا آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

چڑھائی چڑھتے چڑھتے انجن ایک دم گرم ہو گیا۔ اور جب چڑھائی ختم ہوئی تو ریڈی ایٹر کا پانی ابال کھا چکا تھا۔ بونٹ کھول کر جب ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھایا گیا تو بھاپ کی ایک لکیر دور تک اوپر اٹھتی چلی گئی۔ رام بھروسے مخالف سمت سے اپنا ٹرک ان لوڈ کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی روک کر کھڑکی سے گردن باہر نکالی اور عجائب سنگھ کو چھیڑا۔

"ارے یار سردار، تیری جورو تو ایک دم گرم ہو گئی ہے۔"

عجائب سنگھ نے بھی سر کھڑکی سے باہر نکالا اور ہنسنے لگا۔

"ہاں سسر کی بیٹی بڑا نخرہ نگھارتی ہے۔ اس پر سوتن لے آؤں گا تو ساری شیخی دھری رہ جائے گی۔"

لفظ سوتن کو وہ بڑے اچھے معنوں میں استعمال کرتا تھا۔ اسکے مالک جگت بابو عرف بڑے ٹھیکہ دار صاحب نے کتنی ہی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ تم کوئی دوسری گاڑی اپنے چارج میں لے لو، اور یہ گاڑی کسی نئے ڈرائیور

کو دے دو۔ مگر وہ ہر بار انکار کر دیتا۔ پتہ نہیں اس کو اس گاڑی سے کیا انسیت تھی کہ اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اس ڈوج ٹرک کو ہمیشہ سسر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے لوگ اس گاڑی کو عجائب سنگھ کی جورو کہتے تھے۔ اور جب منشی جی اس گاڑی کو کھٹارا کہتے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا اور منشی کو وہ وہ بول سناتا کہ سارا ڈپو ہنسی سے لوٹ لوٹ جاتا۔

عجائب سنگھ ہٹا کٹا تنومند آدمی تھا۔ عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہو گی مگر پندرہ سولہ برس کی مجرد زندگی گزارنے کی وجہ سے ہنوز تر و تازہ دکھتا۔ یوں بڑھاپے نے اپنی نشانیاں دینی شروع کر دی تھیں۔ آنکھوں کے گرد ہلکی سیاہی کے داغ، چہرے کی پختگی اور سر کے بالوں میں اکا دکا چاندی کے تار۔ یہ تمام چیزیں آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھیں۔ لیکن ان کے باوجود وہ ہنوز جوان تھا اور زندہ دل ایسا کہ برداک سے رانچی تک کے تمام علاقے میں بالکل ایک الگ اور منفرد شخصیت ہو کے رہ گیا تھا۔ سارا علاقہ اس کو اس خوبی کی بنا پر چاہتا تھا۔

اس کی اس خوش دلی اور بذلہ سنجی کو نہ اس کی نئی نویلی بیوی کی موت لوٹ سکی نہ اس کی خانماں بربادی۔ اس کو گھر چھوڑے لگ بھگ بیس برس ہو گئے تھے، مگر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ نہ ہی کوئی خط لکھا۔ نہ ہی کسی سے کوئی خیر خبر لی۔ لوگ کہتے کہ یہ دراصل اس کی بیوی کی موت کا غم ہے جو سال بھر اس کے ساتھ رہ کر دوسری دنیا کو سدھار گئی۔ مگر بظاہر کوئی ایسی بات

معلوم نہ ہوتی تھی۔ کیوں کہ جب کبھی اس کی بیوی کا ذکر اٹھتا، تو وہ بڑے اطمینان سے مسکرا کر کہتا۔

"اوئے میری بیوی تو یہ ڈوج ہے۔ یہ سسر کی بیٹی اتنا نخرہ بگھارتی ہے کہ کیا کہوں۔"

یہ سسر کی بیٹی، یعنی وہ ڈوج ٹرک جسے وہ چلاتا تھا کئی برسوں سے اس کی میت تھی۔ اس کے ٹائر گھس جاتے تو بدل دیئے جاتے، انجن ری بور ہو جاتا۔ ایکسل کا اسٹڈس ٹوٹتے اور گلتے، گیئر بکس چیختا، چنگھاڑتا جیسے اپنی خستہ حالی پر احتجاج کر رہا ہو۔ لیکن دونوں کی وفاداری ہنوز برقرار تھی۔ عجائب سنگھ کو اس ٹرک سے بڑا پیار تھا۔ اس کے ساتھ کے ڈرائیوروں کو نئے ماڈل کی گاڑیاں مل گئیں، مگر اس نے کوئی دوسری گاڑی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"اوئے! میں ہرجائی نہیں، دل لگا دیوار سے تو پری کس کام کی۔"

وہ کلکتہ کی کسی تھیٹریکل کمپنی کا ڈائلاگ دہراتا۔

کبھی کبھی اس کے ساتھی ڈرائیور اس سے مذاق کرتے۔

"ارے یار عجائب سنگھ تیری جورو کے ڈیفرینشل میں آواز ہے۔"

"تیری جورو کے جوائنٹ کا ربرک گر گیا ہے، دیکھ تو سہی۔"

ایسی باتوں سے ناراض ہونے کی بجائے وہ اور خوش ہوتا۔ انھیں ترکی بہ ترکی جواب دیتا، ہنستا گاتا، چلا چلا کر باتیں کرتا..... وہ تو ایک ایسا دریا تھا جو تمام آلائشوں کو اپنے اندر سمیٹ کر بھی صاف و شفاف رہتا ہے۔

ڈرائیونگ اس کی اتنی اچھی تھی کہ آج تک کوئی مرغی کا بچہ بھی اس کی گاڑی کے نیچے آکر مرا نہ تھا۔ اس پہاڑی علاقے کے پیچ در پیچ راستے سے خوف ناک گھاٹیوں اور ہیبت ناک موڑوں سے، اس صفائی سے گاڑی نکالتا جاتا، جیسے وہ چیختا چنگھاڑتا ٹرک نہیں، بلکہ ایک کھلونا ہے، جسے وہ جدھر چاہتا ہے گھما لیتا ہے.....

پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک نے اچک کر پنت کی کھڑکی سے جھانکا اور عجائب سنگھ کو اطلاع بہم پہنچائی۔

"سردار جی، ہوا نکل رہی ہے۔"

"کیا۔؟" اس نے ایک دم سے ایکسلیٹر چھوڑ دیا۔ انجن کا شور کم ہوا تو شوں شک..... کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے علی کی طرف دیکھا۔

"دیکھ تو کون چکا ہے؟"

علی نے دروازہ کھولا۔ اور پاؤدان پر اتر کر جھانکنے لگا۔

"استاد، بائیں طرف اندر والا ہے۔"

"ہوا ہے، یا بالکل نکل گئی ہے؟" عجائب سنگھ نے پوچھا۔

"ابھی کچھ ہوا ہے۔ ذرا اسپیڈ سے چلیے تو ہم لوگ وہاں پہنچ کر اسٹپنی لگا لیں گے۔"

عجائب سنگھ نے اسپیڈ ایک دم سے بڑھا دی۔ "سالی کسی دن چین نہیں لینے دیتی۔"

جب وہ کانٹا ٹولی پہنچے۔ جہاں انھیں گاڑی ان لوڈ کرنی تھی تب

تک ٹائر کی ساری ہوا نکل چکی تھی۔ علی گاڑی کے نیچے گھس کر جلدی جلدی جیک لگانے لگا۔ اور عجائب سنگھ نٹ کھولنے لگا۔ دوسری طرف کا ڈالا کھول کر لڑکیاں بیلچے سے بولڈر گرانے لگیں۔ اور پی ڈبلیو ڈی کا گنجا ٹھیکیدار انھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں جیک کھل گیا۔ ہوا ابھی تک شوں شوں کر کے نکل رہی تھی۔ عجائب سنگھ نے جیب سے دو روپے کا نوٹ نکال کر علی کو دیا۔

"تو اس کو بنوا کے کسی دوسری گاڑی سے لے کر آجانا۔ جب تک میں سنگل جگہ پر جاتا ہوں۔ اگر وہاں پہنچ گیا تو جب تک گاڑی لوڈ ہوگی، تم آہی جاؤ گے۔"

علی چلا گیا تو پی ڈبلیو ڈی کے گنجے ٹھیکیدار نے بیڑی سلگائی اور عجائب سنگھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سردار جی! آج تو آپ کا کالا گلاب ایک دم کھلا ہوا ہے! (دی بلیک روز از بلومنگ۔) سونا کو ٹھیکیدار ہمیشہ کالا گلاب کہتا تھا۔ اور ہمیشہ اپنی انگریزی دانی کا اظہار کرتا تھا۔

سونا نے تیکھی نظروں سے ٹھیکے دار کو دیکھا، مگر کچھ بولی نہیں۔

عجائب سنگھ صابن سے اپنے ہاتھ دھوتا ہوا بولا۔

"اے گنجا، تو ہمڑک کا ڈھول بھانک، تیری قسمت میں گلاب کہاں ہے سالے اندھے بھی لال پیلے رنگوں کی بات کرتے ہیں۔"

ٹھیکیدار خوش دلی سے ہنسنے لگا۔ سونا ہاتھ میں بیلچہ لئے ہوئے پیچھے کود گئی۔

"اے چندلا! یہ بیلچہ دیکھتے ہو نا۔ ایک ہاتھ میں بھیجا باہر آجائے گا۔"
یہ بات اس نے غصہ سے نہیں، بلکہ خوش دلی سے کہی تھی اور ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ پسینے اور دھول میں ڈوبا ہوا اس کا چہرا، بکھرے ہوئے میلے بال اور کسا ہوا جوان بدن ایک عجیب دل آویز صورت میں نمایاں ہو اٹھا تھا.....
گاڑی اسٹارٹ کر کے عجائب سنگھ نے لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔
"اے تم لوگوں میں سے کوئی آ کر یہاں گیئر کا ڈنڈا پکڑو۔"
پیچھے ڈالے میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ پھر وہ ایک دوسرے کو ڈھکیل کر بھیجنے لگیں۔ توجا..... نہیں توجا..... آخر سونا اتری اور لجاتی ہوئی سی اس کی بغل میں بیٹھ گئی۔
"دیکھو ذرا سے پکڑے رہنا۔ اگر چھوڑا تو یہیں سے نیچے ڈھکیل دونگا۔"
اس نے دھمکایا۔
جواب دینے کی بجائے وہ کھی کھی کرنے لگی۔
جب گاڑی شہر سے باہر آگئی تو عجائب سنگھ نے کنکھیوں سے اپنے بغل میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے میلے بکھرے ہوئے بال، اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ ایک آوارہ لٹ اس کے رخساروں تک جھول آئی تھی۔ گیئر میں زور لگانے کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا اور سیاہ جلد سرخ آمیز ہو کر تانبے کے رنگ کی ہو گئی تھی۔ اس کی ناک کے نیچے ہونٹوں کے گوشوں میں اور اچکالوں پر یہاں وہاں پسینے کے قطرے یوں